سیدنا یونس علیہ السلام کی مختصر سرگزشت

عبدالکریم اثری

قرآن کریم میں یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں آیا ہے یعنی سورہ النساء ۴، سورہ الانعام ۶، سورہ یونس ۱۰، سورہ الانبیاء ۲۱، سورہ الصافات ۳۷ اور سورہ القلم ۶۸ میں۔ پھر ان سورتوں میں پہلی دو سورتوں میں تو صرف یونس علیہ السلام کا نام دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں کے ساتھ درج ہے علاوہ نام کے اور کچھ نہیں اور سورہ یونس میں صرف آپ علیہ السلام کی قوم کے عذاب سے بچ جانے کا ذکر ہے اور سورہ الانبیاء میں یونس علیہ السلام کو "ذوالنون" کے نام سے مخاطب فرما کر ان کی اس تقریر کا ذکر ہے جو انہوں نے کشتی میں سوار ہو کر کشتی کے مسافروں کو کی اور وہ بھی صرف تقریر کے موضوع کی نشاندہی کی گئی ہے تفصیل نہیں اور یہی وہ تقریر ہے جس کو مفسرین نے دعا کے نام سے موسوم کیا ہے جو یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کے بعد کی تھی اور سورۃ الصافات میں مختصر ذکر ہے جس میں آپ علیہ السلام کی رسالت، رسالت سے پہلی زندگی اور رسالت کے بعد کی زندگی کا اختصار بلکہ اشارات میں ذکر ہے اور سورہ القلم میں آپ علیہ السلام کے "صاحب الحوت" ہونے کا بیان فرما کر رسول اکرم ﷺ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک ہدایت دی گئی ہے اس لئے دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح آپ علیہ السلام کی سرگزشت کو تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ آپ علیہ السلام ان انبیاء کرام علیہم السلام میں سے ایک ہیں جن کا فقط نام یا ان کی تعلیم کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے تفصیل نہیں بیان کی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ مخاطبین اول یعنی عرب، یہود اور نصاریٰ ان انبیاء کرام علیہم السلام کے صرف ناموں سے ہی واقف تھے یا ناموں کے ساتھ کسی نبی کی ایک آدھ بات کا تذکرہ ان کی کتابوں میں تھا جس میں انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور ملایا ہوا تھا اور جو انہوں نے ملایا تھا اس کی تردید کے لئے صرف اتنا ہی ذکر کیا گیا کیونکہ قرآن کریم نے بطور تاریخ ان واقعات کو پیش ہی نہیں کیا بلکہ بطور تذکیر و نصیحت

پیش کیا ہے اور یہی کچھ یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی کیا گیا۔ تاہم جو کچھ ہمارے مفسرین یا مورخین نے تحریر کیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ:

یونس علیہ السلام کی عمر ۲۸ سال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا اور اہل نینویٰ کی رشد و ہدایت کے لئے مامور کیا۔ آپ علیہ السلام ایک عرصہ تک ان کو تبلیغ کرتے رہے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر قوم نے اعلان حق پر کان نہیں دھرا اور تمرد و سرکشی کے ساتھ شرک و کفر پر اصرار کرتے رہے اور گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح اللہ کے رسول کی دعوت حق کو ٹھٹھا بنائے رکھا اور آپ علیہ السلام کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس مسلسل اور پیہم مخالفت و معاندت سے متاثر ہو کر یونس علیہ السلام قوم سے خفا ہو گئے اور ان کو عذاب الٰہی کی بددعا کر کے ان کے درمیان سے اسی غصہ کی حالت میں روانہ ہو گئے۔ تفسیر روح المعانی کے بیان کے مطابق فرات کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا اور آپ علیہ السلام اس کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی نے جب لنگر اٹھایا تو بہت جلد راہ میں طوفانی ہواؤں نے کشتی کو آ گھیرا جب کشتی ڈگمگانے لگی اور اہل کشتی بہت ہی گھبرائے تو اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا آ بیٹھا ہے اور جب تک اس کو کشتی سے الگ نہ کیا گیا تو اس کشتی اور اہل کشتی کی نجات مشکل ہے۔

یونس علیہ السلام نے اہل کشتی کی یہ بات سنی تو ان کو خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو میرا نینویٰ سے وحی کا انتظار کئے بغیر اس طرح چلا آنا شاید پسند نہیں آیا اور اس میں میری آزمائش ہے یہ سوچ کر انہوں نے اہل کشتی سے فرمایا کہ وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگا ہوں مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو مگر ملاح او راہل کشتی ان کی پاکبازی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور آپس میں یہ طے ہوا کہ قرعہ اندازی کی جائے چنانچہ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا۔ تب مجبور ہو کر انہوں نے یونس علیہ السلام کو دریا میں ڈال دیا یا یہ کہ وہ خود دریا میں کود گئے۔

یونس علیہ السلام کو دریا میں گرایا جاتا یا گرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو ایک مچھلی نے نگل لیا لیکن مچھلی کو حکم ہوا کہ صرف نگل لینے کی اجازت ہے۔ یونس علیہ السلام تیری غذا نہیں اس لئے اس کے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔ یونس علیہ السلام جب زندہ اور صحیح و سلامت مچھلی کے پیٹ میں رہے تو انجام کار بارگاہ الٰہی میں اپنی اس ندامت کا اظہار کیا کہ کیوں وہ وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر اور اللہ تعالیٰ سے اجازت لئے بغیر اپنی قوم سے ناراض ہو کر نینویٰ سے نکل آئے اور عفو و تقصیر کے لئے وہ دعا پڑھی جس کو "آیت کریمہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یعنی "لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من

الظلمین "الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے میں تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں بلاشبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کی دردبھری آواز کو سنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ وہ یونس علیہ السلام کو "جو تیرے پاس ہماری امانت ہے اگل دے۔" چنانچہ مچھلی نے ساحل پر یونس علیہ السلام کو اگل دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا کہ کسی پرندہ کا پیدا شدہ بچہ کا جسم بے حد نرم ہوتا ہے اور جسم پر بال تک نہ رہے۔ مختصر یہ کہ یونس علیہ السلام بہت نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیئے گئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک بیل دار درخت اگا دیا جس کے سایہ میں وہ ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔ چند دن کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس بیل کی جڑ کو کیڑا لگ گیا اور اس نے جڑ کو کاٹ ڈالا اور جب بیل سوکھنے لگی تو یونس علیہ السلام کو بہت غم ہوا تب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ان کو مخاطب کیا اور فرمایا اے یونس! تم کو اس بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی چیز ہے مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی جس میں انسان بے بس رو رہے ہیں اور علاوہ ازیں جاندار بھی آباد ہیں اس کو برباد اور ہلاک کر دینے میں ہم کو کوئی ناگواری نہیں ہوگی اور کیا ہم ان کے لئے اس سے زیادہ شفیق و مہربان نہیں ہیں جتنا کہ تجھ کو اس بیل کے ساتھ انس ہے جو تم وحی کا انتظار کئے بغیر قوم کو بددعا کر کے ان کے درمیان سے نکل آئے حالانکہ ایک نبی و رسول کی شان کے یہ نامناسب تھا کہ وہ قوم کے حق میں عذاب کی بددعا کرنے اور ان سے نفرت کر کے جدا ہو جانے میں عجلت کرے اور وحی کا بھی انتظار نہ کرے۔

حقیقت حال اس طرح ہوئی کہ ادھر یونس علیہ السلام کے بستی چھوڑ دینے پر ان کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اللہ کے سچے پیغمبر تھے اس لئے اب ہلاکت یقینی ہے تب ہی تو یونس علیہ السلام ہم سے جدا ہو گئے یہ سوچ کر فوراً بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کے دل خوف و دہشت سے کانپ اٹھے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے تاکہ ان کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کریں اور ساتھ ہی سب کے سب اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنے لگے اور ہر قسم کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے حتیٰ کہ چوپاؤں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی علائق سے کٹ کر درگاہ الٰہی میں گریہ وزاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے کہ "ربنا امنا بما جاء به يونس" "اے پروردگار! یونس علیہ السلام جو تیرا پیغام ہمارے پاس لے کر آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ

قبول فرمائی ان کو دولت ایمان سے نوازا اور ان کو عذاب سے محفوظ رکھا۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یونس علیہ السلام کو اب دوبارہ حکم ہوا کہ وہ نینویٰ جائیں اور قوم میں رہ کر ان کی رہنمائی فرمائیں تاکہ اللہ کی اس قدر کثیر مخلوق ان کے فیض سے محروم نہ رہے چنانچہ یونس علیہ السلام نے اس حکم کا امتثال کیا اور نینویٰ میں واپس تشریف لے آئے قوم نے جب ان کو دیکھا تو بے حد مسرت ہوئی اور انہوں نے مسرت کا اظہار کیا اور ان کی رہنمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔ یہ ہے یونس علیہ السلام کے واقعہ کی وہ ترتیب جو آیات قرآنی کی تفسیر میں تاویلات سے پاک اور صحیح مفہوم کی ترجمان ہے اور بلاشک و ریب مختلف سورتوں کی تمام آیات کے معانی کو کسی جھگڑے کے بغیر صاف صاف ادا کرتی ہے لیکن یہ حقیقت اچھی طرح اس وقت ظاہر ہوگی جبکہ واقعہ سے متعلق اختلافی مباحث کو زیر بحث لایا جائے اور پھر اس تفصیل ترتیب کا موازنہ کیا جائے مگر اس سے پہلے کہ ہم آیات قرآنی کا مطالعہ کر کے اس واقعہ کے ساتھ موازنہ کریں ہم چاہتے ہیں کہ پہلے یہ دیکھیں کہ اس سلسلہ میں یونس علیہ السلام کے متعلق تورات کا کیا بیان ہے اور وہ اس واقعہ کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوا کہاں تک میل کھاتا ہے تاکہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے چنانچہ تورات میں "یوناہ" کے نام سے ایک مضمون اس طرح درج ہے کہ:

"خداوند کا کلام یوناہ بن امتی پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کے خلاف منادی کر کیونکہ ان کی شرارت میرے حضور پہنچی ہے لیکن یوناہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو بھاگا اور یافا میں پہنچا اور وہاں اسے ترسیس کو جانے والا جہاز ملا اور وہ کرایہ دے کر اس میں سوار ہوا تاکہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو اہل جہاز کے ساتھ جائے۔ لیکن خداوند نے سمندر پر بڑی آندھی بھیجی اور سمندر میں سخت طوفان برپا ہوا اور اندیشہ ہوا کہ جہاز تباہ ہو جائے تب ملاح ہراساں ہوئے اور ہر ایک نے اپنے دیوتا کو پکارا اور وہ اجناس جو جہاز میں تھیں سمندر میں ڈال دیں تاکہ اسے ہلکا کریں لیکن یوناہ جہاز کے اندر پڑا سو رہا تھا تب ناخدا اس کے پاس جا کر کہنے لگا کہ تو کیوں پڑا سو رہا ہے؟ اٹھ اپنے معبود کو پکار! شاید وہ ہم کو یاد کرے اور ہم ہلاک نہ ہوں اور انہوں نے آپس میں کہا کہ آؤ قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب سے آئی چنانچہ انہوں نے قرعہ ڈالا اور یوناہ کا نام نکلا۔ تب انہوں نے اس سے کہا کہ تو ہم کو بتا کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب سے آئی؟ تیرا کیا پیشہ ہے اور تو کہاں سے آیا ہے؟ تیرا وطن کہاں ہے اور تو کس قوم کا ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ میں عبرانی ہوں اور خداوند آسمان کے خدا بحر و بر کے خالق سے ڈرتا ہوں تب وہ خوف زدہ ہو کر اس سے کہنے لگے تو نے یہ کیا کیا؟ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ خداوند کے حضور

سے بھاگا ہے اس لئے اس نے تو دان سے کہا تھا۔

تب انہوں نے اس سے پوچھا کہ ہم تجھ سے کیا کریں کہ سمندر ہمارے لئے ساکن ہو جائے ؟ کیونکہ سمندر زیادہ طوفانی ہوجاتا تھا۔ تب اس نے ان سے کہا کہ مجھ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو تو وہ تمہارے لئے ساکن ہو جائے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ طوفان تم پر میرے ہی سبب آیا ہے۔ تو بھی ملاحوں نے ڈنڈا چلانے میں بڑی محنت کی کہ کنارے پر پہنچ جائیں لیکن نہ پہنچ سکے کیونکہ سمندر ان کے خلاف اور بھی زیادہ موجزن ہوتا جاتا تھا۔ اب انہوں نے خداوند کے حضور گڑگڑا کر کہا اے خدا ہم تیری منت کرتے ہیں کہ ہم اس آدمی کی جان کے سبب سے ہلاک نہ ہوں اور تو خون ناحق کو ہماری گردن پر نہ ڈالے کیونکہ اے خداوند تو نے جو چاہا سو کیا اور انہوں نے یوناہ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور سمندر کا تلاطم موقوف ہوگیا۔ تب وہ خداوند سے بہت ڈر گئے اور انہوں نے اس کے حضور قربانی گزرانی اور نذریں مانی لیکن خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ یوناہ کو نگل جائے اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ تب یوناہ کے پیٹ میں خداوند نے اپنے خدا سے یہ دعا کی:

میں نے اپنی مصیبت میں خداوند سے دعا کی اور اس نے میری سنی۔ میں نے پاتال کی تہ سے دہائی دی۔ تو نے میری فریاد سنی۔ تو نے مجھے گہرے سمندر میں پھینک دیا اور سیلاب نے مجھے گھیر لیا تیری سب موجیں اور لہریں مجھ پر سے گزر گئیں اور میں نے سمجھا کہ تیرے حضور سے دور ہوگیا ہوں لیکن میں پھر تیری مقدس ہیکل کو دیکھوں گا۔ سیلاب نے میری جان کا محاصرہ کیا۔ سمندر میری چاروں طرف تھا۔ بحری نبات میرے سر پر لپٹ گئی۔ میں پہاڑوں کی تہ تک غرق ہوگیا۔ زمین کے اڑنگے ہمیشہ کے لئے مجھ پر بند ہوگئے۔ تو بھی اے خداوند میرے خدا تو نے میری جان پاتال سے بچائی۔ جب میرا دل بیتاب ہوا تو میں نے خداوند کو یاد کیا اور میری دعا تیری مقدس ہیکل میں تیرے حضور پہنچی۔ جو لوگ جھوٹے معبودوں کو مانتے ہیں وہ شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں میں حمد کرتا ہوا تیرے حضور قربانی گزاروں گا۔ میں اپنی نذریں ادا کروں گا۔ نجات خداوند کی طرف سے ہے اور خداوند نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا۔

اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے حکم دیتا ہوں تب یوناہ خداوند کے حکم کے مطابق اٹھ کر نینوہ کو گیا اور نینوہ بہت بڑا شہر تھا اس کی مسافت تین دن کی راہ تھی اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن کی راہ چلا اس نے منادی کی اور کہا چالیس روز کے بعد نینوہ برباد کیا جائے گا۔ تب نینوہ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی

منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوہ سے یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پئے لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے ان کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اسے نازل نہ کی۔ لیکن یوناہ اس سے نہایت ناخوش ہوا اور ناراض ہوا اور اس نے خداوند سے یوں دعا کی کہ اے خداوند! جب میں اپنے وطن میں تھا اور ترسیس کو بھاگنے والا تھا تو کیا میں نے یہی نہ کہا تھا؟ میں جانتا تھا کہ تو رحیم و کریم خدا ہے جو قہر کرنے میں دھیما اور شفقت کرنے میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔ اب اے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں کہ میری جان لے لے کیونکہ میرے اس جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ تب خداوند نے فرمایا کیا تو ایسا ناراض ہے؟ اور یوناہ شہر سے باہر مشرق کی طرف جا بیٹھا اور وہاں اپنے لئے ایک چھپر بنا کر اس کے سایہ میں بیٹھ رہا کہ دیکھے شہر کا کیا حال ہوتا ہے؟ تب خداوند نے کدو کی بیل اگائی اور اسے یوناہ کے اوپر پھیلایا کہ اس کے سر پر سایہ ہو اور وہ تکلیف سے بچے اور یوناہ اس بیل کے سبب سے نہایت خوش ہوا۔ لیکن دوسرے دن صبح کے وقت خدا نے ایک کیڑا بھیجا جس نے اس بیل کو کاٹ ڈالا اور وہ سوکھ گئی اور جب آفتاب بلند ہوا تو خدا نے مشرق سے لو چلائی اور آفتاب کی گرمی نے یوناہ کے سر میں اثر کیا اور وہ بیتاب ہوگیا اور موت کا آرزومند ہو کر کہنے لگا کہ میرے اس جینے سے مر جانا بہتر ہے اور خدا نے یوناہ سے فرمایا کیا تو اس بیل کے سبب سے ایسا ناراض ہوا ہے؟ اس نے کہا میں یہاں تک ناراض ہوں کہ مرجانا چاہتا ہوں۔ تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس بیل کا اتنا خیال ہے۔ جس کے لئے تو نے نہ کچھ محنت کی اور نہ اسے اگایا۔ جو ایک ہی رات میں اگی اور ایک ہی رات میں سوکھ گئی اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوٰی کا خیال کروں۔ جس میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ایسے ہیں جو اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے اور بے شمار مویشی ہیں؟ (بائبل پرانا عہد نامہ کتاب یوناہ کے چار ابواب)

ان دونوں عبارات کو بغور پڑھیں۔ یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی لہذا اس میں بیان کیا گیا واقعہ پہلے کا ہے اور اس کے بعد قرآن کریم میں اس واقعہ کا

اشارات میں ذکر آیا اور ازیں بعد مفسرین نے اور مورخین اسلام نے اس واقعہ کو نقل کیا اور جو کچھ نقل کیا وہ مع شے زائدہ ہی ہے جو تورات میں مذکور ہے اس کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر میں نقل کر دیا اور وہ ساری باتیں اب کتب تفاسیر میں اور تاریخ میں آ گئیں جن کا ذکر قرآن کریم میں مطلق نہ تھا بلکہ قرآن کریم میں ان باتوں کی اشارات میں تردید فرمائی تھی تاکہ بات بھی صاف ہو جائے اور یہود و نصاریٰ اور عرب کے لوگ حقیقت حال کو بھی اچھی طرح جانچ لیں اور معلوم کر لیں کہ کوئی نبی و رسول نہ جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی اللہ سے ناراض ہو کر اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے اور کوئی رسول ہجرت کر جانے کے بعد اس مقام کی طرف دوبارہ لوٹ کر رہائش پذیر نہیں ہوتا جہاں سے وہ ہجرت کرے اور نبی و رسول ہونے والے انسان کی زندگی میں نبی و رسول بننے سے پہلے اور بعد کوئی خاص فرق نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ نبوت سے پہلے جو کچھ کہتا ہے وہ من حیث النبوت و رسالت نہیں کہتا اور نبی و رسول بنائے جانے کے بعد جو کچھ کہتا ہے وہ من حیث النبوت و رسالت کہتا ہے یعنی تحدی اور چیلنج سے کہتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا پیغام قوم کو سناتا ہے جس پر کہنے سے پہلے وہ خود اس پر ایمان لاتا ہے کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اس طرح ہو گی جس طرح میں کہہ رہا ہوں اور یہی بات یونس علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ اب قرآن کریم کی آیات کا مطالعہ کریں بعد میں اس کا تجزیہ پیش کریں گے۔ قرآن کریم کی جن سورتوں میں یونس علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا ہے ان کی ترتیب نزول اس طرح ہے۔ القلم:۲، یونس:۵۱۔ الصافات:۵۶ اور الانبیاء:۷۳۔ اس ترتیب سے آیات درج کی جا رہی ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:

فاصبر لحكم ربك ولا تكن لصاحب الحوت اذ نادى وهو مكظوم. لولا ان تدارکه نعمة من ربه لنبذ بالعراء وهو مذموم. فاجتبه ربه فجعله من الصالحين۔ (القلم۶۸:۴۸تا۵۰)

فلولا كانت قرية امنت فنفعها ايمانها الا قوم يونس لما امنوا كشفنا عنهم عذاب الخزى فى الحيوة الدنيا ومتعنهم الى حين۔ (یونس۱۰:۹۸)

وان يونس لمن المرسلين. اذ ابق الى الفلك المشحون. فساهم فكان من المدحضين. فالتقمه الحوت وهو مليم. فلولا انه كان من المسبحين. للبث فى بطنه الى يوم يبعثون. فنبذنه بالعراء وهو سقيم. وانبتنا عليه شجرة من يقطين. وارسلنه الى مائة الف او يزيدون. فامنوا فمتعنهم الى حين. (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۳۹تا۱۴۸)

وذالنون اذ ذهب مغاضبا فظن ان لن نقدر عليه فنادى فى الظلمت ان لا اله الا انت سبحنك انى كنت من الظلمين. فاستجبنا له ونجينه من الغم وكذلك

ننجی المؤمنين۔ (الانبیاء۲۱:۸۷،۸۸)

"پس آپ علیہ السلام (اے پیغمبر اسلام!) اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے۔ اور مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائے۔ جب اس نے پکارا اس حال میں کہ وہ غم و غصہ کو پینے والا تھا۔ اگر اس کے رب کی رحمت اس کی دستگیری نہ کرتی تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیا جاتا اور اس کی دنیا میں مذمت کی جاتی۔ پھر اس کے رب نے اس کو منتخب فرمایا اور اس کو اپنے نیک بندوں میں شامل رکھا۔ (القلم ۶۸:۴۸:۵۰)

"پھر کیوں ایسا نہ ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ" (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس علیہ السلام کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب ان پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک سروسامان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی (ان کو) مہلت دے دی۔" (یونس۱۰:۹۸)

"اور بلاشبہ یونس علیہ السلام ہمارے بھیجے ہوؤں سے تھا۔ جب وہ دوڑ کر ایک کشتی کی طرف گیا جو لوگوں اور سامان وغیرہ سے بھری جا چکی تھی۔ پس وہ بھی بھاگ دوڑ کر ان کشتی والوں کے ساتھ جا ملا (اور ایک خطرناک جگہ پر) یعنی پچھلے والوں میں جا بیٹھا۔ جہاں آپ کے پاؤں کو مچھلیاں چھو رہی تھیں (اور وہ خطرناک جگہ پر بیٹھنے کی وجہ سے) اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا (دل ہی دل میں کہ کچھ وقت پہلے آ جاتا تو اچھا ہوتا) اور اگر وہ تسبیح خوانوں میں سے نہ ہوتا تو وہ مچھلیوں کے پیٹ میں قیامت تک پڑا رہنے والا ہوتا اور وہیں سے وہ دوبارہ اٹھایا جاتا۔ پس اس طرح ہم نے اس کو ایک کھلے میدان میں اتار دیا جہاں وہ آزردہ حال اور دل برداشتہ تھا (کیونکہ کوئی اس کا واقف کار نہ تھا) اور ہم نے اس کے پہلو میں (قریب ہی) ایک بیل اگائی ہوئی تھی (کہ وہ آبادی کے آثار دیکھ لے) اور وہاں سے ہی ہم نے اس کو رسول بنا کر اس بستی کی طرف روانہ کر دیا جس کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ زیادہ نہ تھی (اور وہ بستی وہی نینوہ کی تھی اس لئے کہ وہ) ایمان لا چکے تھے اور ہم نے ان کو ایک وقت تک دنیوی فائدہ حاصل کرنے کی مہلت دے دی تھی۔ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۳۹تا۱۴۸)

"اور" ذوالنون" (یعنی یونس علیہ السلام) جب وہ (نبوت سے پہلے) غصے کی حالت میں چلا گیا پس اس کو یقین تھا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے پس (اس نے بھری ہوئی کشتی کے اندر ہی) شرک جیسے ظلم کے خلاف تقریر شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تمجید و تحمید کو بیان کیا اور اپنے (انسانی) ظلم و زیادتیوں پر خوب روشنی ڈالی پس (اس طرح کے بیان سے) ہم

نے اس کی اس التجا کو شرف قبولیت بخشا اور اس کو اس غم کی (جگہ سے جو نہایت خطرناک تھی) نجات دے دی اور (وہ محفوظ جگہ کی طرف لایا گیا) ہم ایمان والوں کو اس طرح نجات دیا کرتے ہیں۔" (الانبیاء ۲۱: ۸۷: ۸۸)

بات کیا تھی اور اس کو کیا بنا دیا گیا؟ قرآن کریم کے اشارات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ایک نبی و رسول تھے لیکن نبوت و رسالت کے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی قوم کے لوگوں کو توحید الٰہی کا درس دیتے اور ان کو برے کاموں سے روکتے تھے لیکن قوم کے لوگ ایسے تھے کہ وہ آپ کی باتوں پر مطلق کان نہ دھرتے تھے۔ اس طرح وہ قوم کے لوگوں سے دل برداشتہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے کہ ایسے لوگوں کی رفاقت سے الگ تھلگ ہو جانا ان کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے۔ اگرچہ کسی طرف جانے کا کوئی پختہ عزم موجود نہ تھا جب وہ دریائے فرات کے کنارہ پر پہنچے تو فرات پر کشتی نظر آئی تو خیال ہوا کہ اس پر سوار ہو کر دوسری طرف نکل جاؤں اس غرض سے بھاگ دوڑ کر کشتی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کشتی مسافروں سے بھری جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود آپ بھی بھاگ دوڑ کر کشتی تک پہنچ گئے اور کشتی بانوں نے بھی اپنی عادت کے موافق انکار نہ کیا اور کشتی پر سوار ہونے کی دعوت دی۔ آپ علیہ السلام کشتی پر سوار ہونے والوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس طرح سوار تو ہو گئے لیکن بیٹھنے کی کوئی محفوظ جگہ آپ کو نہ مل سکی۔

کشتی کے کنارہ پر ایسی جگہ آپ پاؤں لٹکا کر بیٹھے کہ پاؤں پانی میں چلے گئے گویا کہ مچھلیاں پاؤں کو چھونے لگیں اور اس غیر محفوظ جگہ پر بیٹھ کر آپ کو خطرہ بھی محسوس ہوا کہ اگر ذرا دھکا چل ہوئی یا کشتی نے ہچکولا کھایا تو سیدھا سمندر میں پہنچ جاؤں گا جس کا حاصل کیا ہوگا، بات بالکل واضح ہے لیکن اس کے باوجود کہ آپ ایسی خطرناک جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے آپ علیہ السلام نے ہمت کی لوگوں کے اس جم گھٹے میں وعظ و تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو "لا الہ الا اللہ" کے موضوع پر خوب درس دیا۔ لوگوں نے بھی آپ علیہ السلام کے وعظ سے متاثر ہو کر آپ علیہ السلام کو اس مقام سے اٹھا کر محفوظ مقام پر آنے کی دعوت دی تاکہ آپ علیہ السلام لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنا بیان جاری رکھیں اور آپ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور آپ علیہ السلام نے تین موضوع پر خوب روشنی ڈالی اور توحید الٰہی پر، اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور پاکیزگی پر اور انسان کے کفران نعمت پر۔ کشتی چلتی رہی اور کتنے نازک مراحل سے گزری لیکن آپ علیہ السلام کے وعظ دل نشین کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ سفر زرا شاق نہ گزرا حتیٰ کہ دریا کا دوسرا کنارہ آ پہنچا لوگ اترنے لگے اور اس طرح آپ علیہ السلام بھی کشتی سے اتر گئے۔ سب لوگ اپنے اپنے مقام کی طرف چلے گئے لیکن

آپ علیہ السلام کا کوئی مقام تو موجود ہی نہ تھا آپ علیہ السلام اس میدان میں ٹھہر گئے اور کچھ وقت کے بعد کسی طرف کا رخ کر کے چل پڑے۔ اس طرح چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہنچے کہ وہاں بیلیں وغیرہ نظر آنے لگیں گویا بیل کیا نظر آئی کہ آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہاں رک گئے اور ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اللہ نے پیغام رسالت سے نوازا اور حکم دیا کہ آپ نے ان کو کہا تھا وہ ان کی ہمدردی تھی۔ آپ علیہ السلام پر ذمہ داری کا بوجھ نہیں رکھا گیا تھا لیکن اب یہ آپ علیہ السلام کی ذمہ داری ہے کہ آپ علیہ السلام ان کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلائیں اور یہ بھی کہ ہم نے اس بستی والوں کے دل اب نرم کر دیے ہیں اور آپ علیہ السلام کے وہاں سے نکلنے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ آپ علیہ السلام وہاں جا کر اللہ کا پیغام پہنچائیں وہ یقیناً اس کو قبول کریں گے جہاں نہ ماننے والے رہیں گے وہاں ماننے والے بھی یقیناً موجود رہیں گے۔

اس طرح یونس علیہ السلام کو نبی بنا کر اللہ تعالیٰ نے انہی کی بستی کی طرف روانہ کر دیا اور اب یونس رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نینوی کی بستی کے لوگوں کے رسول قرار پائے اور آپ نے اپنی اس بستی میں دوبارہ جا کر توحید الٰہی کا اعلان فرمایا اور ایک وقت تک بستی والوں کو پیغام نبوت و رسالت پہنچاتے رہے۔ اس طرح یونس علیہ السلام کا بستی کو چھوڑ جانے کا واقعہ آپ کی نبوت کے پہلے کا قرار پاتا ہے اور نبوت سے پہلے کسی جگہ کو کسی وجہ سے چھوڑ جانا شرعی ہجرت نہیں کہلاتا اگرچہ اس کو عرف کے طور پر ہجرت کہا جائے۔ کوئی نبی و رسول جب نبی بنا دیا جائے تو بعد از اعلان نبوت حالات کی خرابی کے باعث اپنے علاقہ سے نکل کھڑا ہو؟ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہجرت کا حکم اس کو اللہ کی طرف سے نہ مل جائے وہ اس جگہ قتل تو ہو سکتا ہے لیکن ہجرت نہیں کر سکتا دوسری بات یہ ہے کہ کوئی نبی بھی اپنے علاقے سے بحکم الٰہی ہجرت کر جائے تو پھر حالات چاہے درست ہو جائیں اور لوگوں کی اکثریت بھی مسلمان و فرمانبردار ہو جائے۔۔ کوئی نبی اس مقام کی طرف لوٹ کر جہاں سے اس نے ہجرت کی تھی رہائش پذیر نہیں ہوتا اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کے واضح ارشادات موجود ہیں جیسا کہ آپ ان آیات کریمات کی تفسیر میں پڑھیں گے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارے مفسرین نے بائبل کا بیان جب پڑھا تو اس سے جو تفہیم ہوتی تھی اس کو اپنی تفاسیر میں بطور تفسیر بھر دیا اور وہ ہمارے ذہنوں میں اس طرح پیوست ہو گیا کہ اب جو بات اس کے مطابق نہ ہوئی اس کے ماننے ہی سے ہم نے انکار کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے کسی بھی نبی و رسول کی نبوت و رسالت کا لحاظ نہ کیا بلکہ ہمیشہ مفسرین کی تفسیر کو پیش نظر رکھا اور ان کا وہ احترام کیا جو احترام نبوت و

رسالت کا ہم پر لازم تھا اور نبی و رسول کو وہ مقام بھی نہ دیا جو مفسرین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ کو دیا گیا۔ بجائے اس کے کہ ہمارے مفسرین کرام قرآن کریم کے الفاظ پر غور و فکر کرتے انہوں نے تورات کے بیان پر غور و فکر کیا اور قرآن کریم کے الفاظ سے وہ مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جو تورات کے بیان کی مطابقت کرے۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ محض اس لئے کہ تورات بھی الہامی کتاب ہے اور مفسرین کرام یہ سمجھے کہ قرآن کریم کی وحی الٰہی کے اس الفاظ سے پہلے کی الہامی کتاب کے ترجمان ہوں گے حالانکہ تورات میں یہود نے تفسیر در تفسیر کرتے ہوئے وہ کچھ بھر دیا جس کا اس کتاب میں نام و نشان بھی موجود نہ تھا۔ آج اگر وہ تورات دنیا میں موجود ہوتی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی تو یہ فرق واضح نظر آتا۔ اس لئے تورات کا وہ حصہ جو قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا بلاشبہ تورات تھا لیکن جن باتوں کو قرآن کریم نے نظر انداز کیا وہ یقیناً یہودی کا اضافہ تھیں۔ اس واقعہ میں بھی اضافہ شدہ باتیں تھیں جن کا قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا لیکن ہمارے مفسرین رحمہم اللہ نے وہ مطلب تورات کی تحقیق کے باعث نکال لیا مثلاً یہ کہ تورات کا بیان ہے:

''یونس علیہ السلام کو اللہ نے نینوی کو جانے کا حکم دیا اور وہ نینوی کی بجائے ترسیس کو بھاگ نکلا اور یافی کی بندرگاہ سے ترسیس کو جانے والے جہاز پر سوار ہوا لیکن خداوند نے سمندر پر بڑی آندھی بھیجی اور سمندر میں سخت طوفان برپا ہوا۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب آئی۔''

لیکن قرآن کریم میں اس کا اشارہ تک نہیں۔ ہاں قرآن کریم میں تھا کہ اذا ابق الی الفلک المشحون فساھم فکان من المدحضین (الصفت ۳۷: ۱۴۰، ۱۴۱) ''جب وہ دوڑ کر ایک کشتی کی طرف گیا جو بھری جا چکی تھی۔ پس وہ ان کشتی والوں میں شامل تو ہو گیا لیکن (کشتی کے ایک کنارے) دھکیل دیئے جانے والوں میں تھا۔ اس سورت کی دو آیتوں میں تین الفاظ ''ابق'' ''فساھم'' اور ''مدحضین'' جو استعمال ہوئے تو مفسرین نے ان کا مفہوم ایسا بیان کیا کہ اس کو جوڑ جاڑ کر وہ مفہوم لے لیا جو ان کو تورات کے بیان کے مطابق نظر آیا اور کہا گیا کہ ابق کہا گیا کہ ابق کا لفظ غلام کے بھاگنے پر بولا جاتا ہے پھر جب یونس علیہ السلام کسی کے غلام نہ تھے تو کہا گیا کہ دراصل وہ اللہ سے بھاگے تھے اس لئے یہ لفظ استعمال ہوا لہٰذا اس سے ''اللہ کے حکم کے بغیر ایک نبی رسول کا ہجرت کر جانا مراد ہے''۔ حالانکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ ''ابق'' کا مطلب خود ''ذہب'' سے بیان کر دیا تھا لیکن اس کی طرف خیال نہ کیا۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی۔

''فساھم'' سے قرعہ اندازی کا تصور محض اس لئے لیا گیا کہ تورات میں قرعہ اندازی کا ذکر تھا

حالانکہ ''ساھم'' ''شارک'' ''شریک ہونا اور شامل ہو جانا تھا یعنی بھاگ دوڑ کر کشتی والوں میں شریک و شامل ہو گئے۔

''مدحضین'' چونکہ تورات میں قرعہ اندازی کے بعد یونس علیہ السلام کے نام پر قرعہ نکلنے اور پھر دریا یا سمندر میں پھینک دیئے جانے کا ذکر تھا اس لئے وہی تصور یہاں بیان کر دیا حالانکہ بات بالکل صاف تھی کہ کشتی والوں میں شامل تو ہو گئے لیکن آپ ان لوگوں میں شامل تھے جو کشتی کے کنارے پر دھکیل دیئے گئے تھے جیسے تنگی کے باعث اکثر ہوتا ہے کہ کشتی کے اندر جگہ موجود نہ رہے تو بعد میں آنے والے کشتی کے کناروں پر بیٹھتے ہیں حالانکہ وہ ایک خطرناک جگہ ہوتی ہے اور بیٹھنے والا اس خطرہ کو جس طرح محسوس کرتا ہے وہ وہی سمجھ سکتا ہے جو اس طرح کے واقعہ سے دوچار ہوا ہو۔ دحض ذلق کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مدحضین کہہ کر مزید بات کی وضاحت فرما دی کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ بہت سے لوگ اور اس پھسلنے والی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے جو نہایت ہی خطرناک جگہ تھی۔ یعنی وہ دھکیل دیئے جانے والوں یا پھسل جانے والوں میں سے تھا۔ اگر وہی مطلب لیا جائے جو مفسرین کرام نے لیا ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ پھینک دیئے جانے والوں میں سے تھا حالانکہ آپ کے ساتھ کسی دوسرے کو پھینکے جانے کا کوئی ذکر کسی مفسر نے بھی نہیں کیا۔

اس طرح ایک آیت میں ''مغاضبا'' کا لفظ تھا اور ایک آیت میں ''نقدر'' کا پہلے لفظ سے اللہ کے ساتھ غصہ ہو جانے کا مفہوم لے لیا کہ اللہ کے ساتھ غصہ میں آ کر چلے گئے کہ اللہ نے اس قوم کو ہلاک کیوں نہ کیا اور دوسرے لفظ کو تقدیر و قدرت سے لے لیا کہ یونس نے سمجھا کہ ہم اس کو پکڑ نہ سکیں گے۔ نام بدھن کہ میں اس طرح کا مفہوم ان الفاظ سے لوں؟ حالانکہ ایسا مفہوم ایک عام مسلمان کے متعلق بھی نہیں لیا جا سکتا۔ ہاں! قوم کے ساتھ غصہ ہونا ایک فطری امر ہے اور وہ بھی اس وقت کی بات ہے کہ آپ ابھی پیغام رسالت و نبوت سے نوازے ہی نہ گئے تھے اور نقدر کے معنی ''تنگی کرنے'' کے ہیں یونس علیہ السلام کو یقین تھا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے چونکہ وہ رسول بنائے جانے والا تھا اس لئے اس کا مکمل بھروسہ اللہ کی ذات پر تھا اور وہی کچھ ہوا جو اس کے ذہن و دماغ میں تھا کہ ہم نے اس پر کوئی تنگی نہ کی بلکہ تنگی کے موقع پر اس کو آسانی بہم پہنچائی۔

تورات میں یونس علیہ السلام کو ان کے نام قرعہ نکلنے کے باعث پھینک دینے کا بیان تھا جیسا کہ لکھا ہے کہ ''تب انہوں نے اس سے پوچھا کہ ہم تجھ سے کیا کریں کہ سمندر ہمارے لئے ساکن ہو جائے؟ کیونکہ سمندر زیادہ طوفانی ہوتا جاتا تھا۔ تب اس نے ان سے کہا مجھ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو

تو تمہارے لئے سمندر ساکن ہو جائے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑا طوفان تم پر میرے ہی سبب سے آیا ہے۔۔۔ انہوں نے یوناہ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور سمندر کا تلاطم موقوف ہو گیا۔" پھر کہا گیا کہ:

"خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ یوناہ کو نگل جائے اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا تب یوناہ نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند سے دعا کی۔۔۔ اور خداوند نے مچھلی کو حکم دیا کہ اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا"۔ قرآن کریم نے ان ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف اصل حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ "یونس علیہ السلام کو کشتی میں ایسی جگہ بیٹھنے کے لئے میسر آئی کہ مچھلیاں آپ کے پاؤں کو چھو رہی تھیں چنانچہ ارشاد فرمایا "فالتقمہ الحوت" "پس مچھلیاں آپ کو چھو رہی تھیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ:

"ما رایت رجلا التقم اذن النبی ﷺ فنحی راسہ" "ابوداؤد باب حسن العشرۃ۔

میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کے کان پر اپنا منہ رکھ کر (قریب کر کے) بات سنا رہا تھا اور آپ ﷺ نے بھی اس کی طرف سر کو جھکایا ہوا تھا"۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ "ان رجالا تم عبد خصاصۃ الباب"۔

اس طرح ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیف انعم وقد التقم صاحب القرن (ابویعلی، ابن حبان، ابن خزیمہ، ابن منذر اور ابن مردویہ وغیرہ)

اس سورت یونس میں یونس علیہ السلام کا واقعہ مذکور نہیں ہے صرف یونس علیہ السلام کے نام کی نسبت کے باعث اس مضمون کو اس جگہ درج کیا گیا ہے مزید وضاحت آیات کریمات کے اصل مقامات پر ہوگی۔ اس جگہ یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ اور اس کی قبولیت توبہ کا بیان ہے وہ بھی اس لہجہ میں کہ "پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ یونس علیہ السلام کی بستی کے سوا کوئی بستی ایسی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی"۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہ بات یونس علیہ السلام کے نبی و رسول بنائے جانے سے بھی پہلے کی بات ہے کہ یونس علیہ السلام نے قوم کو ٹیڑھی راہ چھوڑ کر سیدھی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی تھی اور لوگوں کو کہا تھا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو تم تباہ و برباد کر دیے جاؤ گے اس کا یہ مطلب کیسے لیا گیا یونس علیہ السلام کی ہلاکت کا وقت متعین کر کے اس کا اعلان کر دیا تھا کہ قوم نے اس وقت تک ہلاک ہو جانا ہے لیکن وہ وقت نکل گیا اور قوم ہلاک نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے توبہ اختیار کی۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے بعض مفسرین نے اس کا مطلب بھی صحیح نہ سمجھا کہ سید مودودی نے بھی تحریر فرمادیا کہ "یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بناء پر خدا کے اس قانون سے

مستثنیٰ کی گئی کہ "عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لئے نافع نہیں ہوتا" اور اس طرح سورہ یونس کی آیت ۹۸ کے اس حصہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ "پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس کی قوم کے سوا"۔

(ترجمان القرآن جلد دوم ۳۳۱)

حالانکہ یہ ترجمہ اور اس کی تفسیر کتاب و سنت کی روشنی میں بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ زیر نظر آیت میں کسی جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قوم یونس علیہ السلام پر عذاب آ چکا تھا اور جب وہ عذاب میں گھر گئے تو عذاب کے مشاہدہ کے بعد خوف نے ان کو ایمان پر آمادہ کیا اور پھر سنت اللہ کے خلاف صرف یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو قبول کر کے ان پر سے عذاب ہٹا لیا گیا بلکہ اس آیت میں تو صاف صاف یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لے آئی اس طرح اور بستیوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہیں کر لیا تا کہ جس طرح قوم یونس علیہ السلام اس وقت عذاب سے محفوظ رہی اس طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اس پر نا راضگی کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایمان لا کر دوسری بستیوں کے لوگوں نے بھی قوم یونس علیہ السلام کی طرح کیوں خود کو عذاب سے نہ بچا لیا۔ لیکن تفسیر بالا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ قوم یونس علیہ السلام کے سوا جس قوم نے بھی عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا ہم نے اس کے ایمان کو رد کر دیا مگر قوم یونس علیہ السلام پر مہربانی کی کہ ان کے ایمان بالمشاہدہ کو منظور کر لیا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

اور اگر کوئی شخص اس موقع پر یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کو قوم یونس علیہ السلام ہی کے ساتھ ایسی کیا خصوصیت تھی اور دوسری قوموں کے ساتھ کیا عداوت کہ جس قسم کا ایمان قوم یونس علیہ السلام کا قبول ہوا اس قسم کا دوسری قوموں کا کیوں نہ ہوا؟ تو نہ معلوم اس تفسیر کے قائلین اس کا کیا جواب دیں گے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ قوم یونس علیہ السلام نے عذاب کا مشاہدہ کر کے ایمان قبول کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے صرف دنیا میں اس کو قبول قرار دیا اور ان پر سے عذاب ہٹا کر دنیا کی زندگی میں مہلت دے دی مگر آخرت کا عذاب بحالہ ان پر قائم رہا حالانکہ یہ قول بھی پہلے کی طرح غلط ہے اور قرآن کریم کے سیاق و سباق کے قطعاً خلاف ہے کیونکہ "متعنٰھم الی حین" کا یہ مطلب کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک مفید تھا اور آخرت میں وہ کافر و مشرک ہی شمار ہوں گے۔ جب کہ سورہ یونس علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ قوم یونس علیہ السلام کی منقبت اور گذشتہ اقوام کے ایمان نہ لانے کی مذمت ہی

میں اس واقعہ کو بیان کر رہا ہے اور شاہد بنا رہا ہے اور اس جگہ سیاق کلام ہی یہ ہے کہ دوسری اقوام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا جیسا کہ یونس علیہ السلام کی قوم نے کیا۔

لہٰذا قرآن کریم نے اس شبہ کا جواب پہلے ہی دے دیا تا کہ شبہ کرنے والوں کی نگاہ ذرا تاریخ کے دوسرے ورق پر پڑ جائے وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ قوم یونس حضرت یونس علیہ السلام کے زمانہ میں مومن، عادل اور پاکباز ہو گئی یعنی سچے دل سے توبہ کر لی لیکن ان کی حیات طیبہ کا یہ دور عرصہ تک قائم نہیں رہا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ان میں کفر و شرک اور ظلم و سرکشی کے وہ تمام مواد پھر جمع ہو گئے جس کے لئے یونس علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور اس زمانہ کے بنی اسرائیل کے نبی ناحوم نے اگرچہ ان کو بہت سمجھایا اور ہدایت و رشد کی راہ دکھائی مگر اس مرتبہ گذشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصب العین بنائے رکھا تب وحی الٰہی کی روشنی میں ناحوم علیہ السلام نے نینوٰی کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیش گوئی سے تقریباً ستر برس کے اندر آشوری قوم کا تمدن اور ان کا مرکزی شہر سب بابلیوں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہو گئے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

پس ایک طرف قرآن کریم نے قوم یونس علیہ السلام کے ایمان لانے کی مدحت کی اور ان کو سراہا تو دوسری طرف یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جن افراد نے یہ نیکوکاری اختیار کی ان کو ہم نے بھی سرو سامان زندگی سے نفع اٹھانے کا موقع دیا یعنی عذاب سے بچا لیا لیکن قوم یونس علیہ السلام کی یہ حالت ہمیشہ نہ رہی اور ایک زمانہ آیا کہ انہوں نے پھر ظلم و ستم اور کفر و شرک کو اپنا لیا اور گذشتہ سرکش قوموں کی طرح سمجھانے کے باوجود بھی نہ سمجھی تب اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا جو ”سنت اللہ“ کے مطابق ایسی قوموں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

مختصر یہ کہ علمائے اسلام کی تفسیر کے مطابق بھی صحیح بات یہی ہے کہ قوم یونس علیہ السلام پر ایک دفعہ عذاب نہیں آیا بلکہ یونس علیہ السلام کے قوم سے رنجیدہ خاطر ہو کر چلے جانے کے فوراً ہی ان پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ کہیں ہم عذاب کی لپیٹ ہی میں نہ آ جائیں انہوں نے توبہ کر لی جیسا کہ پیچھے ذکر گزر چکا ادھر ان لوگوں نے توبہ کی اور ادھر یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی و رسول کے عہدہ پر فائز کر کے ان ہی لوگوں کی طرف مبعوث فرما دیا اس طرح یونس علیہ السلام کا زمانہ اپنی قوم کے ساتھ اچھا گزر گیا لیکن یونس علیہ السلام کی وفات کے بعد قوم کے پھر وہی طور طریقے شروع ہو گئے ازیں بعد ان کے پاس ناحوم نبی مبعوث ہوئے چونکہ وہ رسول نہیں تھے بلکہ نبی ہی تھے اس لئے اس قوم کو یونس علیہ السلام کی قوم ہی کہا جاتا رہا ان کی پیش گوئی کے مطابق پھر قوم یونس علیہ السلام پر وہ عذاب آیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا

اور ان کو تہ و بالا کر کے ان کا نام تک مٹا دیا گیا۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوگا کہ یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں جا کر زندہ بچ جانے کے معجزہ سے انکار کیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ کسی انسان کا مچھلی کے پیٹ میں جا کر زندہ نکل آنا نہ بعید از عقل ہے نہ خرق عادت بلکہ آپ ایسے کتنے ہی لوگوں کی کہانیاں سن چکے ہوں گے اور اب بھی اخبارات و رسائل میں ایسی چیزیں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں اصل بات یہ ہے کہ شائقین معجزات کو یہ بھی معلوم نہیں کہ معجزہ کس کو کہتے ہیں؟ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا تو وہ ہر اس بات کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے معجزہ کے نام سے موسوم نہ کرتے حالانکہ علمائے کرام اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ معجزہ کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا؟ اور اس کی کیا شرائط ہیں؟ لیکن جب وہ عوام کے سامنے آتے ہیں تو ان چیزوں کو بیان کرنے اور عوام کی تفہیم کرانے کی بھی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ ہر اس بات کی ترجمانی کرتے ہیں جو پہلے ہی ان عوام کے ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ محض اس لئے کہ ان کی زندگی کی ساری ضروریات کا انحصار عوام کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کو خوش رکھنے اور ان کے ذہنوں کی ترجمانی کرنے ہی سے وہ ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ دکاندار کیا فروخت کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہی چیزیں جن کی عوام کو ضرورت و خواہش ہے اور یہ بھی کہ وہ دوسرے دکانداروں سے سستا بیچنے کی کوشش کرے گا اور زیادہ سے زیادہ دام حاصل کرنے کی بھی۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہیں۔ بالکل اس طرح گاہک کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مجھے چیز اچھی ملے اور سستی بھی کہ دام کم خرچ ہوں اور یہ دونوں باتیں بھی آپس میں متضاد ہیں اب صاحب فن دکاندار کون ہیں؟ وہی جو سستا بیچے، دام بھی زیادہ کمائے اور اپنے خریدار کو یہ بھی باور کرائے کہ خریدار نے اچھا بھی خریدا ہے اور سستا بھی۔ اس لئے اس دکاندار کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے پس یہ دکانداری جانتا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو اس وقت دین کو ایک دکان بنا دیا گیا ہے اور دین کے سارے ٹھیکیدار اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دکاندار ہیں کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے۔ وہ سب کے سب اپنے مال کی حیثیت کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کی مجبوری ہے۔ اس لئے کہ اس کے سوا کام نہیں چلتا۔ بالکل اسی طرح علمائے کرام معجزہ کی تعریف جانتے ہیں؟ معجزہ کس کو کہا جاتا ہے؟ سب ان کو معلوم ہے لیکن وہ سر دردی مول لینا پسند نہیں کرتے اس لئے کہ اس کے سوا کام نہیں چلتا۔

یونس علیہ السلام کے اس عمل کو جو نبوت سے پہلے کا تھا یعنی وحی الٰہی سے نہ تھا بلکہ اپنی تفہیم کے مطابق تھا اور بالکل صحیح تھا اس کو غلطی قرار دے کر اپنی کئی غلطیاں اس میں چھپا دیں اور اس حال کے اندر کس کس نے کیا کیا کچھ چھپایا اس کا بیان بہت لمبا ہے۔ آپ صرف یہ بات یاد رکھیں کہ نبی و رسول بھول

سکتا ہے اس لئے کہ وہ انسان ہوتا ہے لیکن جان بوجھ کر خطا نہیں کر سکتا۔ ہاں! جو کچھ اس سے بھول کر ہو جاتا ہے اس کا اعتراف کر کے اپنی خطا تسلیم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً اس کی معافی کا اعلان ہو جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی عظیم و آخر ﷺ تک ایک ایک نبی کے قصہ کو بغور پڑھتے جاؤ اور اس اصول کو سامنے رکھو انشاء اللہ تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

رہی یہ بات کہ میں نے یونس علیہ السلام کے اس واقعہ کو جب وہ قوم سے ناراض ہو کر اپنی بستی میں نکلے تھے نبوت سے پہلے کا قرار دیا تو خیال رہے کہ میں نے نہیں قرار دیا ہے بلکہ یہ صدر اول میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی میں سے بعض کی تحقیق ہے یا تفہیم ہے بات صرف اتنی ہے کہ میرے دل نے اس کو سچ مان لیا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ ہجرت جیسا فعل نسیان اور بھول سے نہیں ہوتا بلکہ جان بوجھ کر اور سمجھ سوچ کر ہوتا ہے جو ہر غیر نبی کے لئے ضروری ہے کہ جب اس کے حالات ایسا رخ اختیار کر جائیں تو وہ اس مقام سے ہجرت کر جائے لیکن نبی و رسول چونکہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اس لئے وہ اس جان بوجھ کر کرنے والے کام کو ہمیشہ اللہ کی اجازت سے کرتا ہے بغیر اجازت کبھی نہیں کرتا حتیٰ کہ اپنی جان اپنے مالک حقیقی کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور وہ اس میں اپنے مالک کی رضا سمجھتا ہے۔

چنانچہ ابن جریر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یونس علیہ السلام کی بعثت کشتی کے سوار ہونے اور مچھلی کے مذکورہ واقعہ سے بعد ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الصافات کی مذکورہ آیت کی تفسیر)

مزید تفصیل آپ کو انشاء اللہ عروۃ الوثقیٰ کی مذکورہ آیات کے تحت مل جائے گی وہاں سے ملاحظہ فرمائیں اور یاد رکھیں کہ نبوت و رسالت ساری کی ساری معجزہ تھی اور نبی و رسول کا وجود ہی قوم کے لئے سب سے بڑا معجزہ تھا اور انبیاء کرام سے بہت سے معجزات کا صدور بھی ہوا اور قوم کے مطالبہ پر اللہ کے حکم سے چیلنج اور تحدی کے ساتھ ان معجزات کا اعلان بھی کیا اور دنیا نے دیکھا کہ جو کچھ نبی و رسول کی زبان سے نکلا وہی سچ تھا اور وہ ہو کر رہا اور ساری دنیا مل کر بھی اس کو روک نہ سکی۔

یونس علیہ السلام کے زمانہ کا تعین بھی ایک مشکل امر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانہ کا تعین کرتے ہوئے بعض مورخین نے تحریر کیا ہے کہ جب ایران (فارس) میں طوائف الملوکی کا دور تھا اس وقت نینوٰی میں حضرت یونس علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۵۰)

محققین نے فارس کی حکومت کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے ایک حملہ سکندر سے پہلے دوسرا

پارتھوی حکومت یعنی طوائف الملوکی اور تیسرا ساسانی عہد۔ پہلا عہد عروج و ارتقاء کا عہد شمار ہوتا ہے اور اس کی ابتداء تقریباً ۵۵۹ ق۔م سے کی گئی ہے جو تقریباً ۳۲۷ ق۔م یعنی دو صدی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا عہد ۳۲۷ ق۔م سے شروع ہو کر ۱۵۰ تک پہنچتا ہے اور یہی طوائف الملوکی کا دور کہلاتا ہے اور اس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہو جاتا ہے۔ اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نقل کے مطابق یونس علیہ السلام کا عہد ۳۲۷ ق۔م سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے درمیان ہونا چاہیے مگر یہ بات تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے اس لئے کہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مشہور شہر نینوٰی ۶۱۲ ق۔م میں تباہ و برباد ہو چکا تھا اور اہل کتاب کی روایت بھی یہ شہادت دیتی ہیں کہ یونس علیہ السلام کے عہد کے بعد ۶۹۰ ق۔م میں اہل نینوٰی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تب ایک اور اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی اور جب انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی تو نینوٰی کی تباہی کی پیشین گوئی فرمائی اور پھر اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق۔م میں نینوٰی تباہ و برباد ہو گیا۔ اس طرح یونس علیہ السلام کا عہد ۶۹۰ ق۔م سے بھی کچھ پہلے ہونا چاہیے اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ہے کہ یونس علیہ السلام حزقیل علیہ السلام کے معاصر ہیں چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''حزقیل کے یاروں میں تھے یونس علیہ السلام'' (سورۃ الانبیاء) حزقیل علیہ السلام کا زمانہ بھی یہی ہوتا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے موسیٰ اور شعیب علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کے درمیان ان کا ذکر کیا ہے اور اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یونس علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے نبی اعظم و آخر ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قال لا یقولن احدکم انی خیر من یونس بن متی'' (بخاری کتاب الانبیاء) ''فرمایا تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (محمد رسول اللہ ﷺ) بہتر ہوں یونس بن متی سے''

یہ اور اس طرح کی دوسری روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے یہ اس لئے فرمایا تا کہ جو شخص یونس علیہ السلام کے واقعات کا مطالعہ کرے اس کے دل میں ان کی ذات اقدس کے متعلق کوئی تنقیص کا پہلو ہرگز پیدا نہ ہو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء و رسل میں سے ایک تھے اور ان کے تذکرہ کا ذکر کرتے وقت یا اس کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ ایک نبی و رسول کا تذکرہ مطالعہ کر رہا ہے کسی عام آدمی کا یہ ذکر نہیں اور نبی کی زندگی معصوم ہوتی ہے گناہ اس کے قریب نہیں بھٹکتا۔

یونس علیہ السلام کے تذکرہ کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ یونس علیہ السلام اللہ کے نبی و رسول تھے جو آشوری قوم کی طرف نبی و رسول بنا کر مبعوث کئے گئے اور یہ کہ آشوری قوم کا تعلق بھی بنی اسرائیل قوم ہی کے ساتھ تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس نام سے معروف ہوئی۔

۲۔ یونس علیہ السلام نبی و رسول بنائے جانے سے پہلے بھی اپنی قوم کو توحید کا درس دیتے تھے اور کفر و شرک کی باتوں سے روکتے تھے اور قوم کے لوگ محض اس وجہ سے آپ کے درپے آزار تھے اور انجام کار آپ نبوت سے پہلے ہی قوم سے ناراض دکھائی کرکے نینویٰ یا کسی دوسرے مقام کی طرف نکل گئے۔ یونس علیہ السلام اپنی بستی سے نکل کر جب دریائے فرات کے کنارہ کے قریب پہنچے تو ایک کشتی پر سوار ہونے کے لئے بھاگے اور دوڑے تا کہ اس پر سوار ہو کر دریا سے پار ہو جائیں۔

۳۔ یونس علیہ السلام کے کشتی تک پہنچنے سے قبل ہی پوری کشتی سامان اور لوگوں سے بھر چکی تھی اور آپ جب کشتی پر سوار ہوئے تو آپ کو ایک غیر محفوظ مقام پر بیٹھنے کی جگہ ملی جہاں آپ کے پاؤں پانی میں چلے گئے اور مچھلیاں آپ کے پاؤں کو چھونے اور بوسے دینے لگیں اور آپ کے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ اگر کشتی کو ذرا جھٹکا لگا تو میں سیدھا دریا کے اندر چلا جاؤں گا اور جہاں سے قیامت تک نکلنا مشکل ہوگا کیونکہ اس طرح گر کر مچھلیوں اور دریائی جانوروں کی غذا بن کر رہ جاؤں گا۔

۴۔ اس کے ساتھ اللہ نے آپ کی ہمت بندھائی اور اس طرح کے خیال سے آنکھیں بند کر کے توحید الٰہی کا درس دینا شروع کر دیا۔ آپ اللہ کا دین جب بیان کرنے لگے تو لوگوں نے آپ کو کشتی کے اندر ایک محفوظ مقام پر آجانے کی دعوت دی اور آپ کی باتوں کو بڑے غور سے سنا اور آپ کے پیغمبرانہ انداز بیان سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ حتیٰ کہ کشتی بخیریت دریا سے پار چلی گئی۔

۵۔ کشتی سے اتر کر سارے لوگ اپنے اپنے گھروں اور مقاموں کو چلے گئے لیکن آپ اس ساحل پر اتر کر رک گئے اس سے آگے نہیں بڑھے بلکہ دریا کے کنارے کے ساتھ چلنے لگے اس سوچ بچار میں تھے کہ آپ نے ساحل دریا پر ایک جگہ پھل دار بیلیں دیکھیں جس میں آبادی کے کچھ نشانات پائے جاتے تھے۔ ابھی آپ اس آبادی میں نہیں پہنچے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت کے لئے چن لیا اور حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے لوگوں کو جا کر اللہ کا پیغام سنائیں ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ آپ کی قوم اب سیدھے راہ پر لگ چکی ہے اور آپ کی بات بھی سنے گی۔

۶۔ یونس علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد قوم کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یونس علیہ السلام کا یہاں سے

نکل جانا ہی گویا عذاب کی دعوت ہے لہٰذا انہوں نے من حیث القوم اجتماعی توبہ کی اور پوری قوم کی قوم اللہ تعالیٰ کے ہاں گڑگڑا کر رہ گئی چونکہ عذاب الٰہی کا اعلان نہیں ہوا تھا اور قوم نے توبہ کا راستہ اختیار کر لیا تو قوم کی اس توبہ کو منظور فرما کر اللہ نے ایک وقت تک ان کو موقع فراہم کر دیا۔

۷۔ یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام سنانے کے لئے اپنی بستی میں چلے گئے اور وحی الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پیغامات ان کو سنانے لگے۔ آپ کی وفات اس بستی میں ہوئی اور آپ کی وفات کے بعد قوم آہستہ آہستہ دوبارہ کفر و شرک کی طرف مائل ہونے لگی اور ازیں بعد ناحوم علیہ السلام کو نبی بنا کر یونس علیہ السلام کی دعوت کو جاری و ساری رکھا گیا لیکن قوم نے ناحوم علیہ السلام کی سخت مخالفت کی، انجام کار بابلیوں کے ہاتھوں اس قوم کو تباہ و برباد کرا دیا گیا اور صفحۂ ہستی سے ان کا اور انکے شہر نینویٰ کا نام و نشان ہی تقریباً مٹ گیا۔

۸۔ یونس علیہ السلام کے واقع کو بعض مفسرین نے تورات کے بیان کے مطابق بنانے کے لئے قرآن کریم کی آیات کریمات کی تفسیر میں تورات کے بیانات کو مدغم کر دیا جو آہستہ آہستہ زبان زد خاص و عام ہو گئے حالانکہ قرآن کریم میں ان کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

۹۔ یونس علیہ السلام کے انہی واقعات کے پیش نظر جو لوگوں نے بیان کئے تھے مرزا قادیانی نے فائدہ اٹھایا اور اپنی اختراعی اور بناوٹی پیش گوئیوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کی اور صورتحال کو اس نے خوب بگاڑا۔ بعض علمائے کرام نے یونس علیہ السلام پر اجتہادی غلطی کا الزام لگایا جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

۱۰۔ ابن جریر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے یہ بیان کیا کہ یونس علیہ السلام کا اپنی بستی کو چھوڑ جانا نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے بعد از نبوت کا نہیں اور اس طرح کشتی میں سوار ہونا اور ایسے نازک موقع پر توحید کا درس دینا نبوت سے پیشتر کا واقعہ ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

۱۱۔ یونس علیہ السلام کو "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" جو کہا گیا ہے تو یہ آپ کا لقب مشہور تھا اور اس لقب سے آپ یاد کئے جاتے تھے لہٰذا قرآن کریم نے بھی آپ کے ان القاب سے آپ کا ذکر کیا۔

۱۲۔ نبی کریم ﷺ نے یونس بن متی سے اپنے آپ کو افضل بیان کرنے سے جو منع فرمایا تو اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے متعلق لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے اور ایک نبی و رسول کے واقعہ کو عام لوگوں کے واقعہ کی طرح نہ بیان کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

دعوت فکر ونظر

جسٹس ایس۔اے۔ربانی
سابق جج سندھ ہائیکورٹ اور فیڈرل شریعت کورٹ

کیا مسلمان عروج حاصل کر سکتے ہیں؟

ٹیلی ویژن کے ایک چینل پر ایک مذاکرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں یہ سوال زیر غور تھا کہ کیا مسلمان دنیا میں دوبارہ عروج حاصل کر سکتے ہیں اور کیسے؟ مسلمانوں کے زوال کی عمومی وجہ یہ بیان کیا گئی ہے کہ ماضی میں مسلمان حکمرانوں نے قوم کی تعلیم کے لئے اقدام نہیں کئے اور تعلیمی ادارے۔ یونیورسٹیاں اور رصدگاہیں بنانے کے بجائے انہوں نے دوسری عمارتیں بنائیں۔ حل یہ بتایا گیا کہ اگر تعلیم پر زور دیا جائے اور اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں تو مسلمان عروج حاصل کرلیں گے یا کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ کو اگر ہم پاکستان کی نسبت سے سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ فرض کریں کہ یہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کردیے جائیں اور ملک کی بیشتر آبادی ان اداروں سے تعلیم حاصل کر کے ڈگریاں لے لے تو یہ ہو تو سکتا ہے کہ لوگ زیادہ بہتر روزگار حاصل کرلیں اور خوشحال ہو جائیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دنیا میں عروج کیسے حاصل کرلیں گے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی ہے کہ زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے مناسب روزگار بھی حاصل نہ کیئے جا سکیں۔

درحقیقت اس مسئلہ پر غور کے لئے ہمیں پہلے "عروج" اور "تعلیم" کا مطلب طے کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے عروج کا مطلب یہ ہے کہ ہم عقل ودانش اور ذرائع میں دوسری قوموں سے بہتر ہو جائیں یعنی علمی دریافتوں اور ایجادات میں ہم اوروں سے آگے ہوں۔ تعلیم کا مطلب جو اس دور کے مسلمان معاشروں میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے جو علم دریافت کر کے پہلے کتابوں میں لکھ دیا گیا ہے وہ پڑھ لیا جائے اور سیکھ لیا جائے۔ آج کا مسلمان اور خاص طور پر پاکستانی اپنا سارا ذہن اور دماغ صرف ان چیزوں کی تلاش میں صرف کرتا ہے جو پہلے سے موجود ہیں اور دریافت کے بعد کتابوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ اس

کے نزدیک یہی علم اور تعلیم کی حد ہے۔ ریسرچ بھی اسی پر محدود ہوتی ہے اور تحقیقی مقالے مختلف کتابوں سے مواد جمع کر کے ہی بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں علم صرف وہ ہوتا ہے جو پہلے سے دریافت ہو چکا ہے۔ اور ہر شعبے میں ہم نظیریں (Precedents) ڈھونڈنے کو ہی علمی قابلیت تصور کرتے ہیں۔ ہمارے پارلیمانی ادارے ہر مسئلہ پر پچھلی روایت ڈھونڈتے ہیں۔ ہماری عدالتوں میں سارا وقت (Precedents) نظیریں پیش کرنے میں لگایا جاتا ہے۔ ہمارے دفتروں میں وہ شخص بہت قابل سمجھا جاتا ہے جو ہر موقع پر یہ بتادے کہ پہلے ایسے معاملے میں کیا کیا گیا تھا۔

ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ زیادہ اہم علم جو ہمیں دوسروں سے آگے لے جا سکتا ہے وہ علم جو تخلیاتی مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم کتاب سے آگے ہوتا ہے۔ آج تک دنیا میں جتنی بھی ایجادات اور دریافت ہوئیں ہیں وہ اسی علم سے ہوئی ہیں۔ جن لوگوں نے یہ ایجادات یا دریافتیں کی ہیں انہوں نے اس کے لیئے یونیورسٹیوں سے ڈگریاں نہیں حاصل کی تھیں۔ شاید یہ ہو سکتا ہے کہ آپ یونیورسٹی میں کسی اسکالر کو یا سائنٹسٹ دیدیں کہ وہ فلاں چیز کو ایجاد کرلے اور وہ اس میں کامیاب ہو جائے۔

کتابی علم حاصل کر کے ہم کبھی بھی سب سے آگے نہیں نکل سکتے کیونکہ اگر آپ دنیا کی تمام کتابوں کا علم حاصل کرلیں جو کہ ناممکن ہے تو بھی آپ اس سے پیچھے رہیں گے جس نے وہ علم دریافت کر کے کتاب میں لکھا ہے۔ پرانی نظیریں ڈھونڈنے کی عادت ہمارے عروج کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم نے تو اس عمل کو آئینی حیثیت بھی دیدی ہے۔ آئین میں لکھ دیا گیا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی تعبیریں دوسری عدالتوں کے لئے نظیر ہونگی اور ان پر ان کا ماننا ضروری ہوگا۔ یہ آئیڈیا ہم نے انگریز کے زمانے کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے لیا۔ ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ اگر آپ اپنی سوچ اور تخیل سے کوئی انتہائی عالمانہ اور عقل مندی کی بات کریں تو اس کی پچھلی نظیر پوچھی جائے گی اور وہ نہ ہونے پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہ آپ کا اپنا نظریہ ہے۔ لیکن اگر آپ یہ بتادیں کہ یہ بات فلاں فلاں شخص نے فلاں فلاں کتاب میں لکھی ہے تو لوگ کہیں گے آپ تو بہت قابل اور بڑے عالم ہیں۔ یہی ذہنیت ہے جو مسلمانوں کو عروج کی طرف رخ نہیں کرنے دیتی۔

کسی بھی قوم کو اگر عروج حاصل کرنا ہے تو اس کو Original Thinking, Imigination اور ذہن کے تخلیاتی استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی اور یہ سمجھنا ہوگا کہ اصل علم جو عروج کی طرف لیجا سکتا ہے وہ علم ہے جو ابھی کتابوں میں منتقل نہیں ہوا ہے۔ سوچنے کے عمل کو ہی اجتہاد کہا جاتا ہے اور مسلمانوں پر اس کی پابندی لگادی گئی ہے۔ غلام قوموں پر بھی ان کے آقا اس قسم کی پابندی لگا

دیتے ہیں۔ اس طرح ہم دو دفعہ متاثر ہوئے ہیں۔

اداروں کا زوال

جیونیلی وژن کے پروگرام، بچاس منٹ، میں ایک انتہائی اہم موضوع پر مذاکرہ منعقد کیا گیا، موضوع یہ تھا کہ پاکستان میں قومی ادارے زوال پذیر کیوں ہیں؟ حقیقت حال سے واضح ہے کہ تمام ادارے زوال پذیر ہیں، لیکن اس عمل کو کامیابی کے ساتھ روکنے کے لئے انکی حقیقی وجوہات کا پتہ لگانا ضروری ہے۔

مذاکرہ میں مختلف وجوہات بیان کی گئیں اور یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں ادارے بن ہی نہیں سکے۔ لیکن یہ بات حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی، جن اداروں کی بات کی جاتی ہے وہ انگریز کے دور میں ہی اس خطے میں قائم ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے پر بھی ادارے اس ملک میں قائم کر دیئے گئے اور قیام پاکستان کی پہلی دہائی میں یہ ترقی پذیر بھی رہے اور بہت حد تک کامیابی کے ساتھ کام بھی کرتے رہے۔ انکی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں جو لوگ با اختیار تھے انہوں نے قیام پاکستان کی تحریک بھی دیکھی تھی اور وہ قومی جذبے سے سرشار اور اخلاقی قدروں کا لحاظ رکھنے والے لوگ تھے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ دائرہ عمل سے خارج ہوتے گئے اور پہلے مارشل لاء کے بعد دوسرے لوگوں نے انکی جگہ لے لی اور بعد میں آنے والے لوگوں کی اخلاقی قدریں مختلف تھیں۔ یہیں سے پاکستانی معاشرت کا رنگ اور انداز بدل گیا۔ زمام اختیار اب ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں رہی جو قومی جذبے اور اخلاقی قدروں سے لیس تھے۔

بنیادی طور پر پاکستانی معاشرہ قبائلی قدروں اور فیوڈل نظام پر مشتمل ہے۔ قبائلی اور فیوڈل معاشرے کی سب سے بڑی اور اہم قدر طاقت کی پرستش ہوتی ہے۔ طاقتور کی خوشی اور فرماں برداری ہی اس معاشرے کی بنیادی قدر ہوتی ہے۔ باقی قدریں اسی اصول پر مبنی ہیں۔ پاکستانی قومیتوں کا یہی مزاج ملک میں بار بار مارشل لاء لگنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ مارشل لاء فوج کی حکمرانی ہے اور فوج طاقت کا سمبل ہے۔ یہاں جب بھی کوئی جنرل مارشل لاء لگاتا ہے تو معاشرے کا ایک بڑا حصہ اس کا استقبال کرتا ہے اور اپنی خدمات اسے پیش کرتا ہے اور یہ عام سوجھ بوجھ کی بات ہے کہ جس کا استقبال کیا جائے، وہ بار بار آئے گا۔ ہمارے معاشرے کی اس خصوصیت کو دیکھ کر بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں ہمیشہ بار بار مارشل لاء لگتے رہیں گے اور کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی۔ مارشل لاء سے نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ

ہے کہ قوم کا مزاج بدلا جائے تو طاقت کی پوجا کے بجائے دوسری اعلیٰ اور معروف قدروں کو قومی مزاج کا حصہ بنایا جائے ہندوستان اور دوسری مہذب قوموں اور ملکوں میں مارشل لاء نہ لگنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کی فوج کمزور ہے وہاں مارشل لاء اس لئے نہیں لگتا کیوں کہ وہاں جنرلوں کو یہ معلوم ہے کہ قوم ان کا استقبال نہیں کرے گی۔ ورنہ مارشل لاء لگانے کے لئے پوری فوج کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قومی اداروں کے زوال کی دو اصل اور بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک اخلاقی قدروں کا بحران اور دوسرے سوچ کا فقدان کسی بھی قسم کے قانون کی پابندی ہمارا انفرادی اور قومی مزاج نہیں ہے۔ بڑے بڑے قومی اداروں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس معاملہ میں حساس نہیں ہیں کہ ہر حال میں قانون کی پابندی ہونی چاہیے۔ وہ صرف اس حد تک قانون کی پابندی کے قائل ہوتے ہیں جب تک انکا مفاد متاثر نہ ہو اور جب تک کسی صاحب قوت و اختیار کی ناراضگی کا احتمال نہ ہو یہی وجہ ہے قومی اداروں پر سے عام آدمی کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بھی لوگ انفرادی طور پر جھوٹ بولتے ہونگے لیکن ہمارے یہاں قومی ادارے بھی صاف جھوٹ بولتے ہیں جس کی وجہ سے کسی بھی ادارے کی کریڈیبلیٹی باقی نہیں رہی۔ نہ ہم سچ بولتے ہیں اور قانون کی پابندی کو اپنے مفاد سے بالاتر سمجھتے ہیں بلکہ قانون کی خلاف ورزی کو اعلیٰ حیثیت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ ادارے انسانوں کے لئے بنتے ہیں اور جیسے اعتقادات اور اہلیت کے لوگ یہ ادارے چلاتے ہیں اسی پر ان اداروں کی ترقی، استحکام یا زوال کا انحصار ہوتا ہے۔ اداروں کے حوالے سے میرٹ (Merit) انتہائی اہم اور اعلیٰ قدر ہوتی ہے خاص طور سے ان عہدوں کے لئے جو صاحب اختیار ہوتے ہیں۔ یہ اب عام طور مشاہدے کی بات ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے لئے اہلیت کے بجائے اور بہت سی چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آج کے حالات کا اگر غور سے اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو یہاں Misfits کی دنیا نظر آئے گی۔ چند استثناء ضرور دیکھے جاسکتے ہیں۔

اداروں کے زوال کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہماری تمام عقل نقل کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ بغیر مناسب غور وفکر کے ہم دوسروں کے طور طریقے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو بجائے فائدے کے نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ اسکے علاوہ بھی جو بھی تبدیلی بہتری کے لئے کی جاتی ہے وہ بدتری کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ عمل اداروں کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔

اس ملک میں جب بھی کسی شعبہ میں اصطلاحات کی گئی ہیں وہ متعلقہ ادارہ کی بدتری اور زوال کا باعث بنی ہیں اسکی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں تعلیمی اصلاحات کی گئیں اور ڈگری کورس

کو دو سال کے بجائے تین سال کا کر دیا گیا۔ اسکا کچھ مقصد واضح نہ تھا اور یہ کامیاب نہیں ہوا اور تیسرے سال سے پہلے ہی اسکا دورانیہ دوبارہ دو سال کا کرنا پڑا۔ اسکے علاوہ بھی ان اصلاحات سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ تعلیم کا معیار گر گیا۔ ان ہی اصلاحات کے ذریعہ ایک نظام قائم کیا گیا جس کی رو سے امتحان کے کچھ مارکس اساتذہ طلباء کی کورس کے دوران کارکردگی پر دیتے تھے۔ اس سے صرف یہ ہوا کہ طلباء میں خوشامد کی بیماری پھیل گئی زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ استادوں کی خوشامد کے طریقے ڈھونڈنے لگے۔

۱۹۷۲ء میں فوجداری قانون میں اصلاحات کی گئیں اور سیشن کیسوں کا طریقہ کار بدل دیا گیا Committal Enquiry کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ ایسے کیسوں میں انکوائری کرنے کے بعد سیشن کورٹ کو بھیجتا تھا اور جب اس کیس کا نمبر آتا تھا تو وہ مجسٹریٹ یہ انتظام کرتا تھا کہ تمام گواہ سیشن کورٹ میں حاضر ہوں اور سیشن کیس تین یا چار دن میں مکمل ہو جاتا تھا۔ فیصلہ تین چار دن میں ہو جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے سیشن کورٹ کی اتنی اہمیت تھی کہ اس کے نوٹس پر تمام گواہ پیش کر دیئے جاتے تھے۔ اصلاحات کے بعد یہ حال ہو گیا کہ سیشن کورٹ کے وارنٹ کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی اور ان کیسوں کے فیصلہ میں پہلے سے بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ اب سیشن کورٹ کی اہمیت اس زمانے کے مجسٹریٹ جیسی بھی نہیں رہی۔

دفتری کارروائی سے متعلق اصلاحات ۱۹۷۰ء میں کی گئیں جب Section Officers Scheme نافذ کی گئی اسکا مقصد کارروائی کے مرحلوں کو کم کرنا تھا۔ اس سے پہلے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس اسکیم کے ذریعے تین مرحلے مقرر کئے گئے اس کے مطابق کسی بھی معاملہ کی ابتداء سیکشن افسر کے نوٹ سے ہوتی تھی۔ دوسرا مرحلہ ڈپٹی سیکریٹری اور تیسرا آخری سیکریٹری تھا۔ اس اسکیم کا نہ تو کوئی فائدہ ہوا اور نہ یہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہ سکی، کیونکہ ہر ڈپٹی سیکریٹری ترقی کر کے سیکریٹری نہیں بن سکتا تھا اس لئے کچھ عرصہ بعد جوائنٹ سیکریٹری کا عہدہ بحال کر دیا گیا۔ پھر جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ایڈیشنل سیکریٹری کا عہدہ بھی بحال کر دیا گیا۔

سب سے بڑا نقصان اس اسکیم کا صلاحیت کے معاملہ میں ہوا۔ اس اسکیم سے پہلے نوٹنگ اور ڈرافٹنگ کا کام کلرک کا ہوتا تھا جو وہ نہایت کامیابی سے کر رہے تھے ان دنوں کسی کلرک کے لئے یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ نوٹ نہیں لکھ سکتا یا ڈرافٹ نہیں بنا سکتا اس اسکیم کے نفاذ کے وقت جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اب کسی بھی کیس میں پہلا نوٹ سیکشن آفیسر لکھے گا، جو کلاس I افسر ہوگا تو کلرک حیران تھے۔ اس اسکیم

نے صلاحیت کے معیار میں کمی اور افسران کی عزت میں کمی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں نے ایسے ۲۰ گریڈ اور ۲۱ گریڈ کے افسران دیکھے ہیں جو ایک مناسب نوٹ نہیں لکھ سکتے جیسا کہ پہلے کلرک لکھا کرتے تھے۔

ان تمام معاملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاحات کرنے والوں کی سوجھ بوجھ ان نتائج کا اندازہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے مذہبی پیشواؤں نے ہمیں عقل کو نقل تک محدود کرنے کا سبق دیا پھر غلامی کے زمانے میں آقاؤں نے ہماری سوچ پر پابندیاں لگادیں۔ اب ہماری عقل کا کام صرف ان چیزوں کو تلاش کرنے اور اپنانے تک محدود ہو گیا جو پہلے سے کہیں نہ کہیں موجود ہیں ایسی قوم کے ادارے زوال پذیر نہ ہونگے تو اور کیا ہوگا؟

﴿الشریعہ اکادمی کی تازہ مطبوعات﴾

جناب جاوید احمد غامدی کے حلقۂ فکر کے ساتھ

ایک علمی وفکری مکالمہ

ازقلم: ابوعمار زاہد الراشدی / معز امجد / خورشید ندیم / ڈاکٹر فاروق خان

صفحات: ۲۰۰ ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل

ازقلم: ابوعمار زاہد الراشدی

صفحات: ۱۵۲ ۔ قیمت: ۱۳۰ روپے

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
تقسیم کنندہ: دارالکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

وفیات

ہے رشک اک جہان کو "سرور" کی موت پر

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر، سرور نسیم کی یاد میں

جامعہ کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ میرے مرحوم دوست سرور نسیم کا تھا۔ جن کا ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء کو اچانک انتقال ہوا۔ اس سانحہ پر جامعہ کی فضا سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اتنی کثرت اور ایسا اژدحام اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا۔ مرحوم اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں تھے۔ بظاہر ہشاش بشاش، تندرست و توانا اور صحت مند دکھائی دیتے تھے سوائے اس کے کہ گذشتہ کئی ماہ سے بلڈ پریشر کی شکایت بتاتے تھے۔ اور اسکے لئے وہ خاصے فکرمند بھی تھے۔

مرحوم سے میری دوستی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا۔ جب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد قیصر کی اسٹوڈنٹ ایڈوائزری ٹیم میں بطور اسسٹنٹ شامل ہوا۔ مرحوم اس ٹیم میں بہت پہلے سے شامل تھے۔ اس طرح تقریباً روزانہ ہی کبھی کم اور کبھی زیادہ وقتوں کی ملاقاتیں رہنے لگی تھیں۔ انکی خوش مزاجی میں سنجیدگی کی ملونی تھی۔ وہ طلبہ تنظیموں کو شفقت و محبت سے ڈیل کرنے کے قائل تھے۔ طبیعت میں صلح پسندی کا جوہر بھی مبداء فیاض سے ودیعت ہوا تھا۔ حقدار کو حق دلانے میں پیش پیش رہتے تھے اور اگر کسی کا حق مارا جاتا تو مضطرب ہو جاتے تھے۔ تقریباً دو سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں میں نے انہیں بلا مبالغہ ایک با اخلاق، با اصول اور شریف النفس انسان پایا۔ ان کے سانحہ ارتحال پر انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے متعدد دوستوں نے جو اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اظہار واقعی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شرافت و دیانت اور

اصول پسندی کا دورانیہ فقط دو ایک سالوں پر نہیں بلکہ انکی پوری زندگی پر مستولی تھا۔

ان کی وفات سے ایک ہفتہ قبل ان سے میری آخری اور یادگار ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا تھا۔ اس ملاقات کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس بار انہوں نے قدرے غیر معمولی انداز میں میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس ملاقات میں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ جب بھی میں نے ان سے رخصت چاہی، انہوں نے اٹھنے نہ دیا بلکہ ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت بے تکلفی سے کہا دکتور! بیٹھے رہو کہاں جاؤ گے؟ میں نے کہا گھر۔ کہنے لگے، گھر جا کر کیا کرو گے؟ تھوڑا وقت ہمیں بھی دے دیا کرو اور میں ان کے کہنے پر تینوں مرتبہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے چائے کا بھی پوچھا مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اس لیے چائے نہیں پیوں گا۔ مگر شاید وہ خود پینا چاہتے تھے اس لیے منگوالی اور اس دوران میں بھی ان کی اجازت سے گھر آ گیا۔ ملاقات میں پتہ چلا تھا کہ اگلے دن انہیں اسلام آباد جانا ہے۔ اور جامعہ میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے انتظامات بھی ان کے ذمہ ہیں یہ وہ سیمینار تھا، جو ان کی زندگی کا آخری سیمینار ثابت ہوا۔

ماہ رمضان میں مرحوم جس انہماک اور خلوص سے مسجد میں نماز تراویح کے لئے آیا کرتے تھے وہ مناظر بھی قابل یاد ہیں۔ بالعموم عشاء کی اذان وہ گھر میں نہیں مسجد میں آ کر سنتے تھے۔ پھر پہلی صف میں بیٹھنے کا خصوصی اہتمام کرتے۔ ان کی یہ ادا میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مرحوم ایکدن میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے ایک فتویٰ لینا ہے کیا تم فتویٰ دے سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ کہنے لگے وراثت کا مسئلہ ہے، میں نے کہا پوچھو! کہنے لگے میں لکھ کر پوچھوں گا۔ پھر اگلے روز وہ میرے پاس آئے اور استفتا میرے ہاتھوں میں تھمادی۔ پھر تفصیلی جواب کے طالب ہوئے۔ یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ حمایت حق کی جو خوبی اس وقت میں نے ان کے اندر پائی وہ یہ تھی کہ وہ فقط خدا خوفی کے باعث شریعت اسلامیہ کے مطابق وراثت کی تقسیم چاہتے تھے، خواہ ان کے اپنے حصے میں کچھ آئے یا نہ آئے؟ اور یہ دراصل ان کے اپنے من کی وہ بچی پکار تھی، جو ان کا شعار بن چکی تھی۔ رزق حلال کمانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے نظر بھی آتے تھے۔ دوسروں کو ترغیب بھی وہ ایسی

سی باتوں کی دیتے تھے۔ بظاہر تو وہ جوان تھے۔ مگر قدرت نے انہیں دماغ کسی "بزرگ ناصح" کا دیا تھا۔

وہ حد درجہ قابل اعتبار تھے اور رازوں کے امین۔ انجمن اساتذہ کے وہ صدر بھی رہے۔ اور جنرل سیکریٹری بھی اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ محمد قاسم رضا صدیقی کے میڈیا ایڈوائزر بھی اور اس کے علاوہ بھی متعدد عہدوں کے حامل رہے۔ اس عرصہ سیاست وخدمت میں ان کے پاس متعدد اساتذہ کی تحریری شکایتیں موصول ہوئیں مگر وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ کس نے کس کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے۔ الا یہ کہ خال خال۔ تاہم جسکے بارے میں شکایت ہوتی اسے بھی اور جو شاکی ہوتا اسے بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اور نیک مشوروں سے نوازتے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ پانچ بیٹیاں اور ایک دو سالہ بیٹا یادگار چھوڑا ہے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ (آمین)

موت سے کس کو رستگاری ہے؟
آج وہ کل ہماری باری ہے

عرب اور موالی

(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

صفحات: ۳۲۸

قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر: قرطاس

پی او بکس 8453،

کراچی یونیورسٹی، کراچی

نام کتاب: احادیث القرآن (قرآنی حدیثیں)

نام مصنف: ڈاکٹر ازھر ازھری

سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۱۲۰ روپے۔ صفحات: ۱۵۳

ناشر: ایس ایس ٹریڈرز ناظم آباد کراچی پی او بکس ۱۸۰۷۷

تبصرہ نگار: محمد اعظم سعیدی

ڈاکٹر ازھر ازھری کے نزدیک ذخیرہ احادیث چونکہ حضور اکرم ﷺ کے وصال سے تقریباً دو سو سال بعد جمع ہوا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سماعت کرنے والے صحابہ بھی بقید حیات نہ تھے کہ وہ اپنی ذات سے منسوب روایات کی تصدیق وتائید فرماتے اس لئے اس ذخیرہ کو احادیث کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس حوالے اس ان کی پہلی کتاب کا نام "قرآن وحدیث" ہے جس میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے یہ ثابت کیا ہے کہ بخاری ومسلم سمیت جو کچھ حدیث کی کتابوں میں حدیث کے نام سے موجود ہے وہ سب سنی سنائی ناقابل اعتبار روایت ہیں اور ان کتب حدیث میں حدیث ایک بھی نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب "احادیث القرآن" اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے جسکے تعارف میں احادیث رسول کے زیر سایہ احادیث قدسیہ پر بھی آلات سرجری استعمال کر کے سابقہ عنوان کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ احادیث رسول اور احادیث قدسی خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن سے باہر مختلف کتب احادیث میں جو احادیث قدسی یا احادیث رسول کے نام سے معروف ومشہور ہیں وہ روایت پرست حضرات نے ادھر ادھر سے سن سنا کر اسے روایت کا نام دینے کے بجائے قرآن سے لفظ حدیث چرا کر اسے حدیث رسول اور حدیث قدسی کا نام دے دیا ہے۔ بعد ازاں حسب روایت وہی تنقید واعتراضات کا طومار کہ شیخ الحدیث کا عہدہ حاصل کر لیا قرآن کے ساتھ تو صحیح نہیں لکھا جاتا مگر بخاری ومسلم سے پہلے صحیح لکھا جاتا ہے حافظ قرآن کے مقابلے میں حافظ حدیث کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ محیر العقول اور غیر معمولی حافظہ عربوں کا تھا مگر صحاح ستہ کے مؤلفین ایرانی ہیں جیسے سطحی اور استہزائی اعتراضات ہیں جو صدیوں سے دہرائے جا رہے ہیں اور بالا ستیعاب انکے جوابات بھی دیے جا رہے ہیں۔

البتہ ڈاکٹر ازھر کی اس بات میں واقعی وزن ہے کہ دو صدیوں بعد جمع کی جانے والی روایات کو من وعن رسول اللہ کے الفاظ یعنی حدیث رسول کہا جائے یا انہیں روایات کا نام دیا جائے۔ اور مؤلف کا نکتہ نظر یہ ہے کہ ان کو روایات کا نام دیا جائے۔ مگر یہی مؤلف اپنے اس موقف سے اس وقت گریز کرتے نظر آتے ہیں جب وہ کتب احادیث کا استہزاء اڑاتے ہوئے احادیث کے ساتھ ساتھ روایات کی نفی کر جاتے ہیں یعنی جب دونوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر حدیث کو روایت کہنے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے بایں ہمہ ان کا موقف یہی ہے کہ جو کچھ ہے قرآن ہے حدیث کا کوئی وجود نہیں ہے نیز قرآن میں حدیث کو ہی قرآن کہا گیا ہے اور اپنے اس قول کی تقسیم وہ اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں کل اکیس مرتبہ لفظ حدیث مذکور ہوا ہے سورۂ نساء آیت ۸۷ مرسلات آیت ۵۰۔ یوسف آیت ۱۱۱۔ کہف آیت ۶۔ زمر آیت ۲۳۔ جاثیہ آیت ۶۔ نجم آیت ۵۹۔ طور آیت ۳۴۔ واقعہ ۸۱۔ القلم آیت ۴۴ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ سورۂ نساء آیت ۴۲۔ ۷۸۔ ۱۴۰ اور سورۂ تحریم آیت ۳ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس کا معنی بات ہے، اسی طرح سورۂ ذاریات آیت ۲۴۔ نازعات آیت ۱۵۔ بروج آیت ۱۷۔ غاشیہ آیت ۱ میں حدیث سے مراد خبر ہے۔ اور سورۂ انعام کی آیت ۶۸ میں حدیث بمعنی گفتگو اور سورۂ لقمان میں لھوالحدیث بمعنی قصہ کہانی ہے۔ اس تقسیم سے مؤلف نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے حدیث کا اطلاق صرف اس لفظ پر ہوتا ہے جو قرآن میں وارد ہے یعنی قرآن سے باہر لفظ حدیث کی کسی نسبت کو وہ قبول نہیں کرتے۔

اس طرح مذکورہ تالیف میں قرآن وحدیث یا قرآن وسنت کی اصطلاح کو بھی لائق اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس ترکیب کو مفروضہ قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مؤیدین حدیث کے نزدیک شاید آدھا دین قرآن میں ہے اور آدھا دین حدیث یا سنت میں ہے یعنی موصوف کے نزدیک دینی عقائد ونظریات، اور امرونواہی، اخلاقیات ومعاملات، ملکیاتی موزونی معاشرتی ضروریات کا ماخذ صرف اور صرف قرآن مجید ہے احادیث مجموعی طور پر مفروضہ محض ہیں۔ پھر مؤیدین حدیث کی طرف سے خود ہی ایک آسان سے سوال کا جواب دے کر (ص ۲۹۔۳۰) اسے استہزاء اڑا دیتے ہیں۔ جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ازھر نے کتب احادیث اور معہود ذہنی احادیث کی سرجری میں تو کمال فن کا مظاہرہ دکھایا ہے مگر افسوس کہ آلات سرجری مقام آپریشن میں ہی بکھیر بیٹھے ہیں مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۸۷ میں لفظ حدیث ایک مرتبہ آیا ہے مگر ترجمہ میں وہ حدیث بھی لکھتے ہیں بریکٹ میں قرآن بھی لکھتے ہیں اور پھر بات بھی لکھتے ہیں یعنی (جو حدیث (قرآن) کی بات) جب حدیث کو قرآن کہہ رہے ہیں تو پھر قرآن کو بریکٹ کرنے اور پھر حدیث کا معنی بات کرنا چہ معنی دارد۔۔۔ اسی طرح سورۂ مرسلات کی آیت ۵۰ فبای حدیث بعدہ یومنون میں کیا ہے (حدیث (قرآن) کی اور کون سی ایسی بات ہے) اس قسم کی مزید مثالیں بھی موجود ہیں یونہی سورۂ یوسف کی آیت ۱۱۱ کا ترجمہ نامکمل کیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۸۰ کا ترجمہ نامکمل ہے ص ۵۷، سورۂ نساء کی آیت ۳۶ کا ترجمہ نامکمل ہے ص ۵۸۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۷، ۱۱۸ درج کی ہے مگر ترجمہ صرف آخری جملے کا ہے ص ۶۷۔ بعض تراجم آیات تو موضوع سے متعلق حصے کے کیے ہی نہیں ہیں۔

اسکے بعد قرآن بحیثیت حدیث کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو حدیث کا اصطلاحی نام اس لئے دیا ہے کہ یہ حدیث کی لغوی تعریف پر پورا اترتا ہے پھر اگلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ قرآن میں ۲۱ مقامات پر حدیث کا لفظ موجود ہونے کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی ہم کو حدیث محمد، حدیث رسول یا حدیث النبی کی ترکیب والے الفاظ نظر نہیں آئے۔ مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسی ص ۴۰ پر قرآن کے صفاتی ناموں میں ایک نام "قول رسول" وہ بھی آیت قرآن سے ماخوذ کرکے خود ہی تحریر فرما چکے ہیں اور وہ قول اور حدیث میں معنوی یکسانیت سے واقف بھی ہوں گے۔ پھر بھی لکھ دیا کہ حدیث الرسول یا حدیث النبی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے؟ ڈاکٹر صاحب کی کتب احادیث کے آپریشن میں انہماک ویکسوئی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس کاٹ چھانٹ میں قرآنی آیات کی تعداد پر بھی بلیڈ پھیر گئے اور آیات کی تعداد ۶۲۳۶ کر دیں۔

ڈاکٹر ازھر نے قرآنی آیات کی تقسیم میں بھی بڑی عرق ریزی فرمائی ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے قرآن مجید کو احادیث القرآن کا نام دیا پھر ان میں سے احادیث قدسیہ کو الگ فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو آیات یاایھا الذین امنوا۔ یاایھا الناس، یا اھل الکتاب اور یٰبنی آدم سے شروع ہوتی ہے یہ آیات درحقیقت احادیث قدسیہ ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں وہ آیات جو لفظ

یعلمون تک سے شروع ہوتی ہے اور اسکے بعد قل حکمیہ سے جواب کے لئے جو الفاظ وحی کیئے جاتے ہیں وہ حدیث رسول ہیں۔ جیسے سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۷۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۹۔ ۲۱۷۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۲ اور انفال کی آیت ا یہ سب احادیث رسول ہیں یعنی مصنف کے قول کے مطابق الحمد سے والناس تک جو قرآن مجید ہے وہ محض اطلاقاً کلام الٰہی ہے۔ ورنہ زیادہ تر باعتبار لغت وہ احادیث القرآن ہے اور کچھ قرآن کا نام احادیث قدسیہ اور کچھ کا نام احادیث محمدیہ ہے۔ بہر حال کتاب خوبصورت ٹائٹل سے مزین اعلیٰ کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

تعارف کتب

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام دنیائے اسلام میں اجنبی نہیں ہے۔ انگریزی، عربی، اردو و دیگر زبانوں پر عبور رکھنے والے اس عالم دین نے اپنے علم و فضل، حسن تبلیغ اور جوش خطابت سے ایک جہان کو مسحور کیا۔ بیشمار لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ بلکہ جنوبی افریقہ کے ملک ماریشس میں اسلام کا نور انہی کے ذریعہ پھیلا۔ مبلغ اسلام شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ اسی مرد قلندر کے فرزند ارجمند تھے۔ جو انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان تمام جگہوں پر تبلیغ کرتے رہے۔ جہاں جہاں انکے والد محترم نے تبلیغ فرمائی۔ اور اب اسی بطل جلیل و عظیم کے پوتے مبلغ اسلام شاہ محمد انس نورانی صدیقی تبلیغ اسلام کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں انس میاں نے اپنے دادا محترم کی لکھی ہوئی مندرجہ ذیل کتب، کتابچے اور رسالے بھجوائے ہیں یہ ساری تحریریں، انگریزی میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر تحریریں وہ ہیں جو میں نے اپنے بچپن میں پڑھی تھیں۔ ان تحریروں کا کمال یہ ہے کہ ان کی تازگی، سادگی، پرکاری اور ضرورت میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ سالہا سال سے مولانا موصوف کی تحریریں دنیا میں پڑھی جارہی ہیں۔ اور پسند کی جارہی ہیں۔ ذیل میں ان تحریرات کے عناوین درج ذیل ہیں۔

1. Elementary Teaching of Islam Pages 152
2. How to Preach Islam Pages 159

3. Islamic Prayer (Salat) Pages 116
4. The Principles of Islam Pages 30
5. The Pilgrimage to MECCA Pages 28
6. The Forgotten Path of Knowledge Pages 24
7. A Shanian & A Theologian Pages 24
8. Quest for the Happiners Pages 24
9. Cultivation of Science by the Muslims Pages 60
10. Women & Their Status in Islam Pages 24

میاں انس نورانی نے ان تحریرات کو از سر نو شائع کرکے تبلیغ اسلام کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے جو نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ لائق اتباع بھی ہے۔ خدا انہیں اسکا اجر عطا فرمائے۔ ان عظیم تحریرات کے سلسلہ میں ورلڈ اسلامک مشن پاکستان (ٹرسٹ) یونی شاپنگ سینٹر، فلور نمبر ۵ (Suite No. 502, 503) شاہراہ عراق، صدر، کراچی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

ولایت قبلہ المعروف تحویل قبلہ۔ مؤلف محمد علی عبدالکریم۔ صفحات ۱۱۷۔ ہدیہ ۹۰ روپے ناشر: سندس بیڈ شیٹ مرکز 14-A کمرشل شاپنگ سینٹر نیو شکریال کہو روڈ، راولپنڈی۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔

اس کتاب میں قرآن و احادیث و دیگر حوالوں سے ظاہر کیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ ہی قبلہ اول و آخر ہے۔ اور تحویل قبلہ سے مراد ولایت قبلہ یعنی خانہ کعبہ کی تولیت ہے۔ نہ کہ تبدیلی قبلہ۔ کتاب علمی رنگ لئے ہوئے ہے اگر طباعت پر بھی توجہ دی جاتی تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔

کمال تحقیق جلد اول۔ **ترتیب ڈاکٹر انصار الدین مدنی،** صفحات ۵۷۔ ناشر گنج یونیورسٹی، ڈی، کے ۱۰، ۳۸ اسٹریٹ درخشاں فیز VI، ڈی ایچ اے، کراچی۔ ۷۵۵۰۰، قیمت ۱۵۰ اشاعت جنوری ۲۰۰۷ء

اس مختصر رسالہ میں کراچی یونیورسٹی، وفاقی اردو یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی،

پشاور یونیورسٹی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، بہاالدین ذکریا یونیورسٹی، اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز، شعبہ علوم اسلامی، تاریخ اسلام، اور شعبہ عربی سے ایم فل رپی ایچ ڈی کرنے والے محققین رتحقیق نگاروں کے اسمائے گرامی مع ان کے عنوانات کے جمع کر دیے گئے ہیں۔ اچھا ہوتا کہ اس رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا جاتا کہ کس کس عنوان پر ڈگریاں ایوارڈ ہو چکی ہیں اور کتنے عنوانات ہنوز زیر تکمیل ہیں۔ پھر ڈگری یافتہ مقالہ جات کا پاسنگ ایئر بھی درج ہونا ضروری تھا۔ بہر حال اس رسالہ کو الف بائی ترتیب سے از سر نو مرتب کیا جاسکتا ہے۔ باعتبار سنین بھی مرتب کیا جاسکتا ہے اور موضوعاتی اعتبار سے بھی الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ "کمال تحقیق" کے مقابلے میں اگر اس کا نام "جہان تحقیق" رکھا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ رسالہ بہت عمدہ کاغذ پر شائع کیا گیا ہے۔

نوے سالہ اشاریہ

ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

مرتب: محمد سہیل شفیق

صفحات: ۶۴۴

قیمت: ۵۵۰

ناشر: قرطاس

پی او بکس 8453

کراچی یونیورسٹی، کراچی

التفسیر اہل علم کی نظر میں

مفتی محمد یٰسین نعیمی

سربراہ انٹرنیشنل مسلم کونسل

اخی المعظم!۔۔۔ پروفیسر محمد شکیل اوج ابقاکم اللہ وحیاکم بالصحت والعافیہ

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون کہ بحمد اللہ مع الخیر رہ کر متدعی خیریت مزاج گرامی ہوں غیر مترقبہ نعمت کی شکل میں التفسیر موصول ہوا آپ کی تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کے یگانے اور بیگانے سب معترف ہیں حقائق کی عکاسی آپ کا طرہ امتیاز ہے مضمون نگار ایسے ہیں کہ نفس مضمون آپ پر رشک کرتا ہے جس موضوع پر اظہار خیال کریں وہ موضوع اپنی قسمت پر ناز کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی بے شمار خوبیاں ودیعت فرمائی ہیں آپ مجمع الصفات اور قدوۂ روزگار ہیں التفسیر کا ہر مضمون نگار سمندر کے قعر سے درنایاب نکال رہا ہے۔ التفسیر علوم و معارف کا خزینہ و گنجینہ ہے۔ اصحاب فتویٰ کو پروفیسر صاحب یعنی آپ کی بعض تحقیقات سے شدید اختلاف ہے بعض بغاوت من الدین کہتے ہیں بعض مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کہتے ہیں بعض منافی دین جدت طرازی کہتے ہیں اور بعض ماحول کو اسلام کے مطابق کرنے کے بجائے اسلام کو ماحول کے مطابق کرنا کہتے ہیں میری رائے قدرے مختلف ہے کہ آپ کی تحقیقات کو بہ امعان نظر سے دیکھا جائے تو یہی مترشح ہوگا کہ یہ تحقیقات یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا اس حدیث مبارکہ کی توضیح و تشریح ہیں آپ جس منصب جلیل پر فائز ہیں اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دین حق کو اسطرح پیش کریں کہ لوگ دین کو یسرو بشارت سمجھیں عسر و تنفر سے تعبیر نہ کریں یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (القرآن) مگر یسر و بشارت اور عسر و تنفر سب اصول دین کے مطابق ہو آپ وسیع النظر اور دقیق الفکر ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المشرب بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ تمام اسلامی مکاتب فکر میں نہایت موقر ہیں اور آپ کی دینی خدمات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کار کو

ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مجلہ کی اشاعت پر خیر کثیر اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

محمد یسین نعیمی

اے ۱۳۵ بلاک سی گلشن جمال۔ کراچی

Seminar Library
Department of Islamic ...
University of Karach...

ڈاکٹر انصار الدین مدنی

ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ، گرینچ یونیورسٹی، کراچی

گرامی قدر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

مدیر اعلیٰ، ماہنامہ التفسیر، کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

صحت وسلامتی کی نعمت یقیناً عطیہ خداوندی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نعمت سے مستفیض رہنے کا شرف بخش دے۔ (آمین)

ماہنامہ التفسیر یقیناً علمی وفکری پیچیدگیوں کو سلجھانے میں نہ صرف نہایت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ بلکہ عمومی سطح پر قرآنی تعلیمات کو جمودی اور تقلیدی زاویوں سے نکال کر مطالعہ کرنے کا شوق پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی کاوشوں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے مگر آپ کی مصروفیت مجھے نہایت عزیز ہے۔ اس لیے میں مختصر اوقت میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے التفسیر کے شمارے مجھے عنایت کیے ہیں۔ آپ کی اس شفقت علمی کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔ یقیناً آئندہ بھی آپ اس علمی سفر میں ہماری راہنمائی کرتے رہیں گے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

ڈاکٹر انصار الدین مدنی

ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ،

گرینچ یونیورسٹی، کراچی

ڈائری

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

اسٹیل ٹاؤن آفیسرز میس، کراچی میں اسکول کالج اور یونیورسٹی لیول پر طلبہ وطالبات کے مابین (۲۵ فروری بروز اتوار ۲۰۰۷ء) ایک تقریری مقابلہ ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی علامہ اقبال کے اشعار میں سے کسی ایک مصرع کو عنوان تقریر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ گزشتہ دس سالوں سے مجھے اس نوعیت کے پروگراموں میں بحیثیت جج اور کبھی ہیڈ آف دا جیوری کے طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ اور شاید سوائے ایک آدھ بار کے ہر مرتبہ میں شریک بھی ہوا ہوں۔ مگر اس بار میری حیثیت دوہری تھی۔ ابتداً مجھے مہمان مقرر کے طور پر اسٹیج پر جگہ دی گئی (میرے ساتھ صدر تقریب کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر سید اظہر احمد (ایم بی ایس) وائس چانسلر بقائی یونیورسٹی، کراچی اور مہمان خصوصی کے طور پر ممتاز سفارت کار جناب قطب الدین عزیز تھے اور ہاں پیر محمد افضل چشتی بھی مہمان کے طور پر اسٹیج پر جلوہ افروز تھے) پھر قدرے توقف کے بعد جج کے فرائض بھی سونپ دیے گئے۔ طلبہ وطالبات کی بچی، کھری اور خالص گفتگو سننے کا موقع ملا۔ اکثر تقریروں میں سیاسی رنگ کی چاشنی تھی۔ حالانکہ علامہ اقبال نے یہ مصرع سیاسی پس منظر میں نہیں بلکہ تعلیم وارشاد کے پس منظر میں کہا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی مصرع کو اگر سیاق وسباق سے نکال کر کوئی دوسرا البادہ مفہوم پہنا دیا جائے تو بھی وہ بے مزہ نہیں ہوتا بلکہ بعض حالات میں تو وہ بہت مزہ دیتا ہے۔ شاید حد سے بھی سوا۔ یہی کچھ حال اس مصرع کے ساتھ بھی ہوا۔ ایکس متنوع معانی ومفاہیم کا ایک جہان سمٹ آیا تھا۔ میں نے گذشتہ سالوں کے تجربے سے جو کچھ سیکھا تھا وہ اپنی مختصر سی تقریر میں معزز سامعین کو بتانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا کہ کسی چیز کے بارے میں سو فیصد رائے ہونا یقین کہلاتا ہے اور مذہب کی اصطلاح میں اسی یقین کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اگر معاملہ ففٹی ففٹی ہو جائے تو پھر شک پڑ جاتا ہے۔ جو یقین کا نقیض ہے۔ اگر معاملہ میں ففٹی پرسنٹ سے کم درجہ کا اعتبار ہو تو اسے وہم کہا جاتا ہے۔ اور اگر معاملہ ففٹی پرسنٹ سے اوپر اور صد فیصد سے کم ہو تو اسے ظن کہا جاتا ہے۔ اور ظن شرعی اور

اخلاقی ہر دو حیثیت سے لائق حجت اور واجب التعمیل ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر فیصلے ظن کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور انہیں تسلیم بھی کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ تمہید اس لئے اٹھائی تھی کہ سامعین کو باور کرا سکوں کہ طلبہ و طالبات کی تقریروں پر اول و دوئم اور سوئم کا فیصلہ بھی یقین کی بنیاد پر نہیں بلکہ ظن کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ یہ ظن کسی پلاننگ یا تعصب کا نتیجہ نہ ہو، مگر انسان بہر حال خطا کا پتلا ہے وہ غلطی کر جاتا ہے۔ اس کا غلط فیصلہ عند الناس تو نافذ العمل ہو جاتا ہے مگر فیصلہ کرنے والا عند اللہ مجرم ضرور بن جاتا ہے۔ اس منصب پر فائز ہونے والوں کو اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ میں نے ظن کے حجت ہونے پر مثالاً یہ بھی کہا کہ ہمارا کاروبار کرنا ظن کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ یقین کی بنیاد پر اس طرح ہماری شادیاں بھی ظن کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ گواہوں کی گواہیاں بھی ظن کی بنیاد پر قبول کی جاتی ہیں۔ نہ کہ یقین کی بنیاد پر اور اس سے ملتی جلتی کچھ دوسری مثالیں بھی دیں۔

پیر محمد افضل چشتی اور کچھ دوسرے سامعین کو میری تمہیدی گفتگو اچھی لگی، اختتام تقریب پر انہوں نے اسے دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنکر یاد کرنے کی کوشش کی۔ اور اصطلاحات مذکورہ کی تعریفات کو میرے سامنے دہراتے رہے۔ تقریب کے محرک اور منتظم محترم ڈاکٹر نصر اللہ تھے۔ جو الحدید فاؤنڈیشن، گلشن حدید کراچی کے بانی و چیئرمین ہیں۔ اور معروف سماجی شخصیت ہیں اور اپنے مشن میں انتہائی متحرک، فعال اور مخلص بھی ہیں۔ میرے علم کے مطابق وہ تقریباً پچیس سالوں سے معاشرے کی اصلاح کے لئے مختلف نوعیتوں کے بیشمار پروگرام منعقد کر رہے ہیں۔ یہ پروگرام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور انہیں ان کے مشن میں کامیاب بھی۔ (آمین)

ختم قرآن کی ایک تقریب

۲۳ مارچ بروز جمعہ گلشان ہاؤسنگ پروجیکٹ کراچی ایسٹ میں قرآن مجید کے تعلق سے ایک تقریب میں مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو تھا اس تقریب کی علت یہ تھی کہ انہتر سالہ ایک بزرگ اور گیارہ سالہ پوتی نے قرآن مجید ناظرہ ختم کیا تھا۔ یوں یہ تقریب ختم قرآن کا شکرانہ تھی۔ اور ایک پہلو سے انہیں دوسروں کے لیئے ترغیب بھی تھی کہ قرآن کسی بھی عمر میں پڑھا جاسکتا ہے۔ مجھے فرسٹ ٹائم اچنبھا ہوا تھا۔ جب میں نے مدعو ہوتے وقت اپنے بزرگ دوست چوہدری عطا محمد سے سنا کہ انہوں نے

اس عمر میں قرآن پڑھنا سیکھا ہے۔ کیونکہ بالعموم قرآن چھوٹی عمر میں پڑھ لیا جاتا ہے اور ویسے بھی چوہدری صاحب تقریباً بارہ تیرہ سال پہلے میرے درس قرآن میں بہت پابندی سے آیا کرتے تھے اور قرآن سمجھنے کی کوشش میں ان کا اخلاص بھی کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ شرکائے درس میں وہ اسی اخلاص اور دلچسپی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ میں کیا کوئی بھی باور نہیں کر سکتا تھا کہ چوہدری صاحب قرآن پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ بہر حال منسٹری آف ڈیفینس کے ریٹائرڈ سینیئر ریسرچ آفیسر چوہدری عطا محمد اور انکی پوتی یمنیٰ ریاض نے اب قرآن مجید پڑھ لیا ہے۔ تقریب کی مناسبت سے میں نے اپنی مختصر گفتگو میں دادا اور پوتی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ قرآن مجید کی جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تھی تو ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ اس سورۃ سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے؟ بلاشبہ مومنوں کے ایمان نہ صرف نزول سورۃ سے بڑھ جاتے ہیں بلکہ وہ متنزل سورۃ پر خوشیاں بھی مناتے تھے۔ اور اسی طرح جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے اوپر نازل ہونے والی سورۃ کو سنا رہے ہوتے تو یہ منظر منافقوں پر بہت شاق گزرتا تھا اور وہ ایک دوسرے کو اشارۃً مجلس سے اٹھ جانے کا کہتے تھے۔

قرآن کے تعلق سے یہ دو رویے ہیں جو خود قرآن میں مذکور ہوئے ہیں۔ اسمیں ہمارے لئے غور و فکر کا سامان موجود ہے۔ کچھ لوگ قرآن کی باتوں پر خوش ہوتے ہیں جبکہ کچھ لوگ ایسی محفلوں اور مجلسوں سے ہی اٹھ جاتے ہیں۔ جہاں قرآن بیان ہو رہا ہوتا ہے۔ اول الذکر رویہ مومنوں کا ہوتا ہے اور ثانی الذکر منافقوں کا۔ ہمیں اس قرآنی معیار پر اپنے آپ کو جانچنا ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن مجید کا پڑھنا بلاشبہ ایک سعادت ہے۔ مگر اس کی تفہیم انسان کی ضرورت ہے۔ قرآن کو بغیر سمجھے پڑھنا خود کو دھوکہ میں مبتلا رکھنا ہے۔ انسانی ذات کی تکمیل قرآن کی تعمیل میں مضمر ہے۔ اور تعمیل بغیر تفہیم کے ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کے بغیر انسان مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ فرد کی نشوونما اور تکمیل انسانیت کے لئے قرآن سے تعلق اور اسکی طرف مراجعت ناگزیر ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کو اپنی شب بیداریوں میں ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا خصوصی حکم حضور ﷺ کو دیا گیا۔ ترتیل کا معنی ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ جسے فی زمانہ تجوید و قرآت کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ جو کہ صحیح نہیں ہے۔ ترتیل کا مطلب کلام الٰہی کو سمجھ سمجھ کر پڑھنا ہے۔ اور سمجھ کر پڑھنا ٹھہرے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کو بجائے تجوید و قرات کے مفہوم میں لینے کے تفہیم کے مفہوم میں لینا چاہیے۔ سورۂ فرقان کے مطابق رحمٰن کے بندے اپنی راتیں اپنے رب کے لئے حالت سجدہ اور حالت قیام میں گزارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی شب بیداریاں بھی ترتیل قرآن کی متقاضی ہوتی ہیں کیونکہ حالت قیام، نماز کی ایک قدرے لمبی حالت کا نام ہے۔ جسمیں قرآن پڑھا جاتا